یشوما اور سُرخ تیر

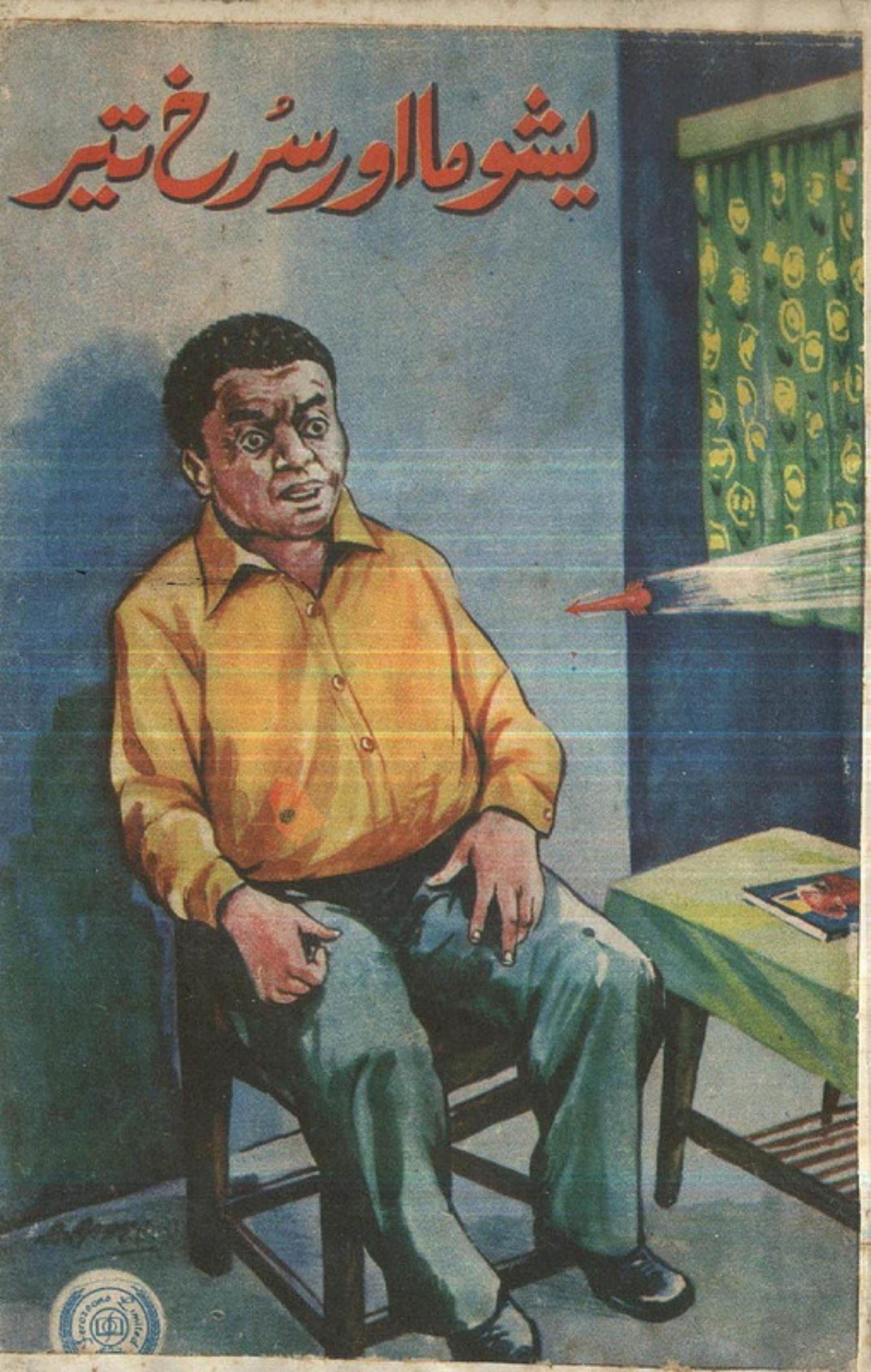

سُرخ تیر: پہلا حصّہ

یشوما اور سُرخ تیر

بچّوں کے لیے ناول

سُرخ تیر: تیسرا حصّہ

سُرخ تیر کے قیدی

بچّوں کے لیے ناول

سُرخ تیر: چوتھا حصّہ

سُرخ تیر کی وادی میں

بچّوں کے لیے ناول

سُرخ تیر: دوسرا حصّہ

سُرخ تیر کا شکار

بچّوں کے لیے ناول

ہوا کا دِل

آصف اور آفتاب سردیوں کی چھٹیاں گھر پر ہی گزار رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آفتاب کے والد کامران مرزا کے دوست منوّر علی خان اپنی بیٹی فرحت کے ساتھ ان کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ اسی لیے وہ اس مرتبہ اپنی خالہ کے ہاں نہیں جا سکے تھے۔ شروع شروع میں انھیں اس بات کا افسوس تھا، لیکن فرحت کی شوخ طبیعت نے انھیں جلد ہی اپنی طرف متوجّہ کر لیا اور وہ تینوں ہر وقت ساتھ کھیلنے کُودنے اور پڑھنے لگے۔

انسپکٹر کامران مرزا دفتر سے گھر آتے تو منوّر علی خان انھیں لے کر بیٹھ جاتے۔ شطرنج کی بازی ایسی جمتی کہ انھیں تن بدن اور کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ گھر کا ملازم فضلو ان کے کمرے میں داخل ہوتا اور انھیں اندھیرے میں شطرنج کی بساط پر بُت بنے پاکر بلب جلا دیتا تو وہ اس

طرح چونک اٹھتے جیسے کسی ڈاکٹر نے ان کے
میں ٹیکا لگا دیا ہو۔ اس وقت کامران مرزا چلّا
کہتے:

"فضلو کے بچّے! کس نے کہا تھا تمھیں بتّی جلا
کو؟ سارا مزا کرکرا کر دیا۔"

"حضور، اندھیرے میں آپ کو کیا نظر آرہا تھا
فضلو مسمسی صورت بنا کر کہتا۔

"چپ بدتمیز! خبردار جو تو نے آئندہ بتّی جلا
ہمارا مزہ خراب کیا۔ اب پھر سے چال سوچنی پڑے

بچوں کی محفل الگ جمتی۔ وہ اپنے کمرے میں کیر
جما کر بیٹھ جاتے، یا بیڈمنٹن شروع کر دیتے۔ گرم گر
چائے، چلغوزوں اور مونگ پھلیوں کے دور چلتے۔ عزیز
چھٹیاں بہت پُر لطف گزر رہی تھیں۔

ایک دو دن سے آصف اور آفتاب چپ چپ
کیوں کہ چھٹیاں ختم ہونے میں صرف دو دن باقی تھے اور منّا
خاں نے چائے کی میز پر یہ اعلان کر دیا تھا
پرسوں وہ چلے جائیں گے۔ دونوں کو رہ رہ کر فرحت
سے جدا ہونے کا خیال ستاتا۔ وہ کچھ کر بھی تو نہیں
تھے۔ تفریح پر تعلیم تو قربان نہیں جا سکتی۔ پھر

سوچ رہے تھے کہ فرحت کے ابّا جان سے ایک
ہفتہ اور ٹھہرنے کی درخواست کریں۔ شاید وہ مان جائیں۔
ان مصیبت یہ تھی کہ اس وقت وہ شطرنج میں مگن
تھے اور اس عالم میں ان سے بات کرنا ناممکن تھا۔

دونوں خود پر جبر کر کے، فرحت کے ساتھ اپنے
کمرے میں کیرم کھیل رہے تھے۔ کمرے کی کھڑکی جو
باغ میں کھلتی تھی، بند تھی۔ کیونکہ باغ میں سے
بہت سرد ہوا اس کھڑکی کے ذریعے کمرے میں آتی تھی،
اتنی سرد کہ ان کے دانت بجنے لگتے۔ اسی لیے
انھوں نے کھڑکی بند کر رکھی تھی۔

گرم کپڑے پہنے، ہیٹر لگائے، کیرم کھیلتے ہوئے
بھی وہ اداس تھے۔ فضلو ابھی ابھی چائے تپائی پر رکھ
گیا تھا مگر انھوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ
دیکھا تھا۔ آخر فرحت سے رہا نہ گیا۔ بول ہی اٹھی:

"بے چاری چائے کا کیا قصور۔ مجھے یہ چائے تھوڑا
ہی لے جانی ہے۔ اگر ہم نے اسے نہ پیا تو یہ ہمیں
دعا دے گی۔ دیکھو تو، کس بے چارگی سے آہیں
بھر رہی ہے۔"

"آج نہ جانے تمھاری باتوں پر ہنسی کیوں نہیں

آ رہی، فرحت۔ تم پرسوں چلی جاؤ گی نا، شاید اسی لیے۔"
آصف نے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں پھر آؤں گی۔ اور ہاں، اس قدر ٹھنڈی آہیں نہ بھرو، کمرے میں ٹھنڈ بڑھ جائے گی۔"

"ہم تمھارے اوپر ایک درجن کمبل ڈال دیں گے۔ ہمیں آہیں بھرنے سے نہ روکو۔" آفتاب نے مسکرا کر کہا۔

"شکر ہے، تمھارے چہرے پر بھی مسکراہٹ آئی۔ میں تو سمجھی تھی اب تم ساری زندگی نہیں مسکراؤ گے۔ آؤ چائے پئیں۔"

"کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ چائے تو ہمارے بالکل قریب رکھی ہے۔" آفتاب مسکرایا اور پھر کہنے لگا "ویسے اگر تم ایک ہفتہ اور ٹھہرنے کا پروگرام بنا لو اور اپنے ابّو کو راضی کر لو تو میں تمھارے کہنے پر ایک درجن پیالیاں چائے کی پینے کو تیار ہوں۔"

"آج بات کیا ہے؟ تمھاری زبان سے لفظ درجن بار بار نکل رہا ہے۔"

"لیکن ابھی تو صرف دو مرتبہ نکلا ہے۔ ایک درجن مرتبہ تو نہیں نکلا۔"

آفتاب کی بات پر دونوں مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔
پھر آصف بولا:

"آخر ایک ہفتے کے لیے رک جانے میں حرج ہی کیا ہے؟"

"تم تو جانتے ہی ہو، ہم تینوں اس دفعہ میٹرک کا امتحان دے رہے ہیں۔ اس کے لیے تیاری کی ضرورت ہے۔ اگر ہم تیاری نہیں کریں گے تو اچھی ڈویژن کیسے لے سکیں گے۔ اس لیے مجبوری ہے۔"

"تیاری تو یہاں رہ کر بھی ہو سکتی ہے۔" آفتاب بولا۔

"لیکن سکول سے تو ایک ہفتے کی غیر حاضری ہو جائے گی۔"

"اچھا بابا، جاؤ۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ کیا کر سکتے ہیں۔ مجبور ہیں۔ لاچار ہیں۔ بےبس ہیں۔" آصف نے کہنا شروع کیا، لیکن آفتاب درمیان میں بول اٹھا "بس بس۔ دو چار لفظ میرے لیے بھی رہنے دو۔ ہاں تو فرحت، آصف تمھیں بتا چکا ہے کہ وہ کیا کچھ ہے۔ اب مجھ سے سنو۔ مسکین ہیں، غریب ہیں، مایوس ہیں۔"

"بس۔ میں سمجھ گئی۔ بہت اچھی طرح سمجھ گئی۔" فرحت نے گھبرا کر کہا۔

"شکر ہے، ورنہ تمھیں سمجھانے کے لیے تو دن رات

ایک کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر بات تمھارے ذہن نشین ہوتی ہے۔" آصف مسکرایا۔

"تو میں کوڑھ مغز ہوں۔ یہی مطلب ہے نا تمھارا؟"

"ہمارا تو نہیں۔ تم خود ہی یہ مطلب نکال لو تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"معلوم ہوتا......"

فرحت کے الفاظ درمیان ہی میں رہ گئے۔ کسی نے پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی کو زور زور سے دھڑ دھڑایا تھا۔ تینوں نے چونک کر پہلے کھڑکی کی طرف دیکھا، پھر ایک دوسرے کی طرف اور نظروں ہی نظروں میں پوچھا:

"یہ کون ہے جو کھڑکی کھٹ کھٹا کر ہمیں پریشان کر رہا ہے؟"

"شاید کوئی موسیقی کا شوقین ہے۔ [illegible] بجا کر اپنا شوق پورا کر رہا ہے۔" فرحت نے [illegible] میں کہا کہ وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہوا [illegible] تھپیڑ رسید کر رہی ہو۔" آفتاب نے اپنا خیال ظاہر [illegible] دونوں نے اس کی تائید میں سر ہلائے۔

"تو پھر چھوڑو۔ چال چلو۔ اگر یہ ہوا ہے تو اسے

اپنا دل بہلانے کا پورا پورا حق ہے۔" فرحت مسکرائی۔

"ہوا کا دل!" آصف نے کہا اور قہقہے لگانے لگا۔

"نہ نہ۔ ہوا ڈر جائے گی۔ اتنے بلند قہقہے نہ لگاؤ۔"

اسی وقت کھڑکی کو پھر دھڑ دھڑایا گیا۔ اس مرتبہ پہلے کی نسبت زیادہ زور لگایا گیا تھا۔ تینوں نے ہاتھ روک لیے اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔

"کہیں یہ کوئی بھوت تو نہیں ہے؟" آفتاب نے پریشان ہو کر کہا۔ کیوں کہ بھوتوں کے خیال سے ہی اس کی جان نکلتی تھی۔

"ضرور بھوت ہی ہو گا، ورنہ اتنے زور سے کھڑکی نہ کھٹ کھٹاتا۔" فرحت بولی۔

"لیکن اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" آصف نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"شش.... شاید اسے سردی لگ رہی ہے اور سردی سے بچنے کے لیے وہ اندر آنا چاہتا ہے۔" آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

"لیکن ہمارے پاس تو صرف تین لحاف ہیں، ہم اسے کہاں سے دیں گے۔" آصف نے کہا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"کیوں نہ میں کھڑکی کھول کر دیکھ لوں؟"

"چاہے تمہیں بھوت دبوچ ہی لے۔" آفتاب گھبرا گیا۔

"ڈرپوک کہیں کے۔ اب کھڑکی تم ہی کھولو گے۔" آصف نے اسے گھورا۔

"کک۔۔۔کیا۔۔۔۔ میں کھولوں گا؟ ہرگز نہیں۔ بھوت مجھے کاٹ کھائے گا۔"

"کاٹ کھانا کتوں کا کام ہے، بھوتوں کا نہیں۔ چلو، اٹھو۔ کھولو کھڑکی۔"

"نن۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔"

تینوں چونک اٹھے۔ اس مرتبہ کھڑکی کا دروازہ زور زور سے جھنجھوڑنے کے ساتھ کسی نے کچھ کہا بھی تھا۔ الفاظ ان کے کانوں سے ٹکرائے ضرور تھے لیکن ان کی سمجھ میں نہ آسکے تھے۔

"باغ میں کوئی بھوت نہیں ہے۔ انسان ہے۔" آصف نے سرگوشی کی۔

"لیکن اس کی آواز تو بھوتوں والی ہی لگتی ہے۔" فرحت نے بھی دبی آواز میں کہا۔

"ٹھہرو، میں کھڑکی کھولتا ہوں۔" آصف اٹھتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ کھڑکی میں کھولوں گا، کیونکہ میں ڈرپوک ہرگز

نہیں۔" آفتاب نے اکڑ کر کہا۔

فرحت اور آصف نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ آصف تو دبے پاؤں کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا اور فرحت کھڑکی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی کہ اچانک آفتاب کو ایک خیال آیا۔ وہ لپک کر آصف کے پاس پہنچا اور سرگوشی کی:

"باغ میں کوئی دشمن بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"ہاں۔ اس کا بھی امکان ہے۔ لیکن کھڑکی تو ہمیں کھولنی ہی پڑے گی۔" آصف نے کہا اور کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے آفتاب کو اشارہ کیا۔ دونوں کھڑکی کے دائیں بائیں دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ فرحت یہ دیکھ کر گھبرا گئی کیونکہ وہ کھڑکی کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ وہ جھٹ اٹھی اور کمرے کے ایک کونے میں دبک گئی۔

آصف آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ چٹخنی کی طرف بڑھا رہا تھا۔

تین چیخیں

کامران مرزا اس وقت تک مُنوّر علی خاں کو تین مرتبہ مات دے چکے تھے اور خاں صاحب بہت جھلّائے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اُنھوں نے تلملا کر کہا تھا "آج جب تک میں تمھیں مات نہ دے دوں گا، بساط نہیں اُٹھائی جائے گی۔" کامران مرزا صرف مُسکرا کر رہ گئے تھے

مُنوّر علی خاں بہت بڑے زمیندار تھے اور شکار کے بے حد شوقین۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصّہ جنگلوں کی خاک چھاننے میں گزارا تھا۔ ان کا یہ شوق انھیں افریقہ کے خوف ناک جنگلوں میں بھی لے گیا تھا اور بیسیوں مرتبہ وہ موت کے مُنھ میں جاتے جاتے بچے تھے، لیکن شکار کے شوق سے باز نہیں آئے تھے۔

دُوسری طرف کامران مرزا کو شکار سے چڑ تھی۔ وہ کہا کرتے تھے "بھلا یہ بھی کوئی شوق ہے۔ سارا سارا دن جنگلوں میں مارے مارے پھرو۔ کوئی شکار ہاتھ آجائے تو اسے بھون

کر کھا لو، ورنہ بھوکوں مرو۔ ارے، میں کہتا ہوں، اس قدر مُصیبت جھیلنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بازار سے ہر قسم کا گوشت مل جاتا ہے۔ گائے، بکری، مُرغ، تیتر، بٹیر۔ پھر آخر شکار کھیلنے کی کیا ضرورت ہے۔ شکار ہی کھیلنا ہے تو اُن لوگوں کا کھیلو جو وطن کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ مثلاً چور، ڈاکو، لٹیرے، سمگلر، غُنڈے اور دُشمن مُلک کے جاسوس۔ ایسے لوگوں کا شکار کھیل کر آتا ہے صحیح لُطف۔ یہ کیا ہوا کہ ننھے مُنّے جانوروں کے پیچھے بھاگتے پھرو۔ اُن کا بھی خُون خشک کرو اور اپنا بھی۔"

"کیا ان ننھے مُنّے جانوروں میں شیر اور ہاتھی بھی شامل ہیں؟" مُنوّر علی خاں مُسکرا کر پُوچھ بیٹھتے تو کامران مرزا اور بھی جھنجھلا جاتے۔

انسپکٹر کامران مرزا محکمۂ سُراغ رسانی کے مانے ہوئے افسر تھے۔ اُنھوں نے بڑے بڑے مجرموں کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ جب کسی سے کوئی کیس حل نہ ہوتا تو انسپکٹر کامران مرزا کے سُپرد کر دیا جاتا۔ وہ ہر کام خوش ہو کر قبول کرتے اور چند ہی دنوں میں مجرم اُن کی گرفت میں آجاتے۔

آفتاب اور آصف گہرے دوست تھے اور اُن کے والد بھی۔ ان کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ ان دنوں آصف

کے والد ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ گھر پر اکیلا تھا، اس لیے دن رات آفتاب کے ساتھ ہی لگا رہتا تھا۔

کامران مرزا نے پہلو بدلا اور چال چلتے ہوئے کہا "شہ!"

منوّر علی خان گھبرا کر ایک چال چلے۔ اب پھر دونوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"تو تم پرسوں جا رہے ہو؟" کامران مرزا نے ان کا دھیان بٹانے کے لیے کہا۔

"چال چلو، چال۔ مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش نہ کرو۔"

"میں باتوں میں لگانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ بس بات واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم پرسوں نہیں جا سکو گے۔"

"کیا مطلب؟ کیوں نہیں جا سکوں گا؟" منوّر علی خاں چونکے۔

"بچے نہیں جانے دیں گے۔ تینوں بہت گھل مل گئے ہیں۔"

"لیکن سکول جو کھل رہے ہیں۔"

"اس کے باوجود وہ یہ چاہیں گے کہ فرحت ابھی کچھ

دنوں اور رُک جائے۔"

"اور سکول کا کیا بنے گا؟ تینوں دسویں جماعت کا امتحان دے رہے ہیں۔"

"اور تینوں بہت ذہین ہیں۔ ان کا امتحان میں اچھی ڈویژن سے پاس ہونا کچھ مشکل نہیں۔" کامران مرزا نے مسکرا کر کہا۔

"تو یہ کہو، ان سے زیادہ تم ہمیں روکنے کے لیے بے تاب ہو۔ شطرنج میں برابر جیت رہے ہو نا، اس لیے۔ کبھی میرے ساتھ شکار پر چلو، پھر میں دیکھوں گا کتنے پانی میں ہو۔" منوّر علی خان نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"مجھے اگر شکار کا شوق ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں شکار کھیل ہی نہیں سکتا۔ کسی دن اتفاق ہو گیا تو میں تم سے پیچھے ہرگز نہیں رہوں گا۔"

"تو پھر کیوں نہ کل ہی چلا جائے؟"

"یہاں کوئی ایسی شکار گاہ ہے ہی کہاں۔ میں تو شیر، چیتے، ہاتھی اور گینڈوں کا شکار کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر میرے ساتھ افریقہ کے جنگلوں میں چلو۔" منوّر علی خاں پرجوش لہجے میں بولے۔

"میں کوئی بے کار آدمی نہیں ہوں۔ سرکار سے تنخواہ

لیتا ہوں، اور مفت تنخواہ لینا میری عادت نہیں۔"

"بس، ڈر گئے؟" منوّر علی ہنسے۔

"تم ٹھہرے زمیندار، تمھیں تو ملازمت پر جانا نہیں پڑتا۔ ادھر اپنا یہ حال ہے کہ ایک دن کی چھٹی کر لوں تو محکمے میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ کئی کیس اُلجھ جاتے ہیں۔"

اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ کامران مرزا نے چونک کر دیکھا۔ فضلو ڈرے ڈرے انداز میں اندر جھانک رہا تھا۔

"کیا بات ہے، فضلو؟" اُنھوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"سرکار، کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں۔ کیوں، کیا بات ہے؟"

"جی، کچھ نہیں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ آپ لوگ آرام نہیں کریں گے؟"

"جب تک منوّر علی مجھے مات نہیں دے دیتے آج شطرنج کی بساط نہیں اُٹھے گی۔ کیا تم کافی پلا سکتے ہو؟"

"جی ہاں، جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ ابھی لاتا ہوں۔" فضلو مڑتے ہوئے بولا۔

"بچے کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ کیرم کھیل رہے ہیں۔"

"ابھی تک کھیل رہے ہیں، جاؤ، پہلے اُن سے کہو، کھیل بند کر کے آرام کریں۔"

"میں یہ کہنے کے لیے جا چکا ہوں۔ لیکن اُدھر بھی بازی زوروں پر ہے، اور تینوں سونے کو تیار نہیں۔"

"آخر ہمارے ہی بچے ہیں۔" منوّر علی نے ہنس کر کہا۔

"ٹھیک ہے، ہمیں کافی دے دو۔ بچوں کو کافی ہرگز نہ دینا۔" کامران مرزا نے ہدایت کی۔

"جی، میں جانتا ہوں، سرکار۔ ویسے، انھوں نے کبھی کافی نہیں مانگی۔"

"بہت خوب۔ اب تم ہمارا کافی وقت ضائع کر چکے ہو۔ کافی دینے کے بعد تم آرام کرنے کے لیے جا سکتے ہو۔ اور درمیان میں ہرگز نہ آنا، ورنہ پھر کافی تیار کرنا پڑ جائے گی۔"

"بہت بہتر، سرکار۔" فضلو نے کہا اور جانے کے لیے مڑ گیا۔

"یہ تمھارا ملازم بھی عجیب ہے۔ اس طرح خیال رکھتا ہے جیسے گھر کا ملازم نہ ہو، بڑا بوڑھا ہو۔" منوّر علی نے

اس کے جانے کے بعد کہا۔

"بہت وفادار ہے۔ جب تک بیگم زندہ رہیں، اس کے گُن گاتی رہیں۔ اس نے اُنھیں بہت آرام پہنچایا۔ بہت خدمت کی اور اب ہم اسے مُلازم نہیں، گھر کا ایک فرد ہی سمجھتے ہیں۔"

"بے ایمانی کے اس دور میں ایسے مُلازم کہاں ملتے ہیں۔" مُنوّر علی خاں بولے۔

"ہاں۔ اب چال چلو۔ چوتھی مرتبہ مات کھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"ہرگز نہیں۔ میں یہ بازی نہیں ہاروں گا۔"

وہ ایک بار پھر جُٹ گئے۔ فضلو دس منٹ بعد ہی کافی لے آیا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا "میں بچّوں کے پاس جا رہا ہوں۔ شاید انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو۔"

لیکن اچانک اس کے قدم رک گئے۔ کامران مرزا اور مُنوّر علی خاں بھی چونک اُٹھے۔ ان کے کانوں سے تین ملی جُلی چیخیں ٹکرائی تھیں اور یہ چیخیں آفتاب، آصف اور فرحت کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھیں۔

"ارے! یہ بچّوں کو کیا ہوا؟ یہ کیوں چیخے ہیں؟"

"خُدا جانے کیا بات ہے۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

فضلو نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں فضلو، اس کی ضرورت نہیں۔ ضرور کسی کی ہار جیت پر چیخے ہوں گے۔ بھلا اور کیا بات ہو سکتی ہے۔" مُنوّر علی بولے۔

"جی اچھا۔" فضلو نے کہا اور باورچی خانے کی طرف مُڑ گیا۔

ایک بار پھر گھر پر سکون کی فضا طاری ہو گئی تھی۔ چوتھی بازی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ مُنوّر علی خاں اپنا پُورا زور لگا رہے تھے۔ کامران مرزا بھی کچھ جھنجھلا گئے تھے اور جلد از جلد مُنوّر علی کو گھیر لینے کی کوشش میں تھے۔

اچانک اُنھوں نے دوڑتے قدموں کی آواز سُنی۔ وہ گھبرا گئے۔ اُٹھ کر دروازے کی طرف لپکے۔ دوسری طرف سے فضلو بدحواسی کے عالم میں دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ ان کے قریب پہنچ کر وہ گر پڑا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور ہونٹ کچھ کہنے کے لیے پھڑپھڑا رہے تھے، بالکل کسی زخمی پرندے کی طرح۔ کامران مرزا گھبرا گئے۔

"کیا بات ہے، فضلو؟ خیر تو ہے؟ کیا تمھیں کوئی ڈاکو نظر آ گیا ہے، یا پھر کوئی جن بھوت دیکھ لیا ہے تم نے؟"

"سس ... سرکار ... سرکار .... وہ .... وہ۔" کپکپاتی ہوئی آواز میں فضلو کے منھ سے نکلا۔

"وہ .... وہ کیا؟" کامران مرزا نے جلدی سے پوچھا۔

"بچ .... چوں .... کے .... کمرے میں ... وہ ... وہ۔"

اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے تیر رہے تھے۔ کامران مرزا کے ہوش اڑ گئے۔ انھوں نے سوچا، تو بچوں کے کمرے میں کوئی گڑ بڑ ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ان کے چیخنے کی جو آوازیں سنی تھیں، وہ کسی ہار جیت کی وجہ سے نہیں ابھری تھیں۔

اس خیال کے آتے ہی کامران مرزا دوڑ پڑے۔ منور علی خاں ان کے پیچھے لپکے۔ فضلو فرش پر بے ہوش پڑا رہ گیا۔

خوفناک آدمی

آفتاب نے آواز پیدا کیے بغیر چٹخنی گرا دی اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ سرد ہوا کا ایک تھپیڑا کمرے میں در آیا اور وہ کپکپا اٹھے۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے دو کالے سیاہ ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر جمتے دیکھے۔ پھر کوئی اچک کر کمرے کے اندر آ رہا۔ جوں ہی تینوں کی نظر اس پر پڑی، ان کے منھ سے بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔

انھوں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ خوف ناک آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا رنگ توے کی مانند سیاہ تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تیز اور چمک دار تھیں۔ ناک بہت موٹی اور بھدّی تھی۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ہاتھ بہت بڑے تھے۔ انگلیاں موٹی موٹی تھیں۔ اس کے پورے جسم میں اگر کوئی چیز سفید رنگ کی تھی تو وہ اس کے ہونٹ تھے جو بہت موٹے

اور نیچے کو لٹکے ہوئے تھے، بالکل اسی طرح جیسے اُونٹوں کے ہوتے ہیں۔ اس کے جسم پر میلا سیاہ کوٹ تھا۔ کوٹ کے نیچے سُرخ رنگ کی قمیص تھی۔ پتلون بھی سیاہ تھی، لیکن تینوں کپڑے بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ قمیص کے کالر میں سے نکلنے والے دھاگے صاف نظر آ رہے تھے۔

وہ خاموشی سے کھڑا تینوں کو گھورتا رہا۔ وہ بھی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ پھر اچانک وہ مُڑا اور اس نے کھڑکی کے پٹ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ اب وہ پھر ان کی طرف مُڑا۔

"تم کون ہو، اور کیا چاہتے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اگر چور ڈاکو ہو تو سُن لو، اس گھر سے کچھ بھی نہ لے جا سکو گے۔" آصف نے تیزی سے کہا۔

وہ اس پر بھی خاموش کھڑا رہا، جیسے بہرا ہو اور اس نے آصف کے مُنہ سے نکلنے والے الفاظ نہ سُنے ہوں۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟ یوں خاموش رہنے سے کام نہیں چلے گا۔" آفتاب بولا۔

اس مرتبہ اس کے لب ہلے۔ اس نے کچھ کہا تھا، لیکن

الفاظ ان کی سمجھ میں نہیں آئے۔ نہ جانے وہ کون سی زبان بول رہا تھا۔

"اوہ! یہ اُردو نہیں جانتا۔" فرحت کے مُنہ سے نکلا۔

"اُردو نہیں جانتا، تو یہ ہمارے مُلک میں کہاں سے آگیا؟" آصف نے پُوچھا۔

"خُدا جانے کیا چکر ہے۔"

"آخر یہ چاہتا کیا ہے؟ یہ یہاں کیوں آیا ہے اور کون ہے؟" فرحت ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

"ویسے اس کے ارادے خوف ناک نہیں لگتے۔ یہ خوف زدہ لگتا ہے۔ کہیں کوئی اس کے پیچھے تو نہیں لگا ہوا۔"

"خُدا جانے۔ یہ تو اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب یہ ہماری زبان سمجھتا ہو۔"

"کیوں نہ اس سے انگریزی میں پُوچھا جائے؟" فرحت نے تجویز پیش کی۔

"ٹھیک ہے۔" آفتاب نے کہا اور اس اجنبی سے انگریزی میں پُوچھا کہ وہ کون ہے۔ لیکن شاید وہ انگریزی بھی نہیں جانتا تھا۔ بیوقوفوں کی طرح انھیں دیکھتا رہا۔ وہ سوچ میں ڈوب گئے کہ کیا کریں! اسی وقت انھوں

نے برآمدے میں قدموں کی چاپ سُنی۔ کوئی ان کے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ وہ چونک اُٹھے۔ اجنبی نے بھی گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

فضلو کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ ابھی تک اس کی نظر اجنبی پر نہیں پڑی تھی۔ پھر جوں ہی وہ دروازے کے قریب پہنچا، اس خوف ناک آدمی کو دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگا۔ اجنبی گھبرا گیا تھا۔ دُوسرے ہی لمحے وہ تیر کی طرح دروازے کی طرف جھپٹا اور اسے بند کر کے چٹخنی لگا دی۔

اب وہ تینوں اس کے ساتھ کمرے میں بند تھے۔ اس وقت تک ان کی سمجھ میں یہ مُعاملہ بالکل نہیں آیا تھا۔ اچانک ان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اجنبی کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں رینگ گیا تھا۔ دُوسرے ہی لمحے اُنھوں نے اس کے ہاتھ میں ایک چاقو دیکھا۔ کڑکڑ کر کے کھلنے والے چاقو کی خوف ناک آواز نے ان کے جسموں میں سردی کی ایک تیز لہر دوڑا دی۔

اجنبی نے چاقو ہوا میں لہراتے ہوئے انھیں اشارے سے بتایا کہ اگر اُنھوں نے کوئی حرکت کی، حلق سے آواز نکالی یا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ اس

چاقو سے ان کو ختم کر دے گا۔ اجنبی کی اس لرزا دینے والی دھمکی نے ان کی رہی سہی جان بھی نکال دی۔ تینوں سوچ رہے تھے کہ بیٹھے بٹھائے کس مُصیبت میں پھنس گئے۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ وہ اس کی زبان نہیں سمجھتے تھے، ورنہ اُسے باتوں میں لگا کر کوئی گُل کھلانے کی کوشش کرتے۔ لیکن اس حالت میں وہ بالکل بے بس تھے۔

موت ان سے صرف چند انچ کے فاصلے پر تھی! عین اسی وقت اُنھوں نے کسی کے قدموں کی آواز سُنی۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کے والد ان کی امداد کو آ رہے ہیں۔

کامران مرزا اور مُنوّر علی خان بے تحاشا دوڑ رہے تھے۔ برآمدے کے آخر میں بچّوں کا کمرا تھا اور اس کے ساتھ ہی صدر دروازہ۔ پھر جوں ہی دونوں وہاں پہنچے، صدر دروازے پر ایک زور دار دستک ہوئی۔ وہ ٹھٹک کر رُک گئے۔ کامران مرزا چکرا کر رہ گئے کہ کیا کریں؟ پہلے صدر دروازہ کھول کر دیکھیں کہ آنے والا کون ہے، یا پہلے بچّوں کے کمرے میں جائیں؟ آخر اُنھوں نے مُنوّر علی خاں سے کہا:

"تُم صدر دروازہ کھول کر دیکھو، کون ہے۔ میں بچّوں

کے کمرے میں جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" منوّر علی خاں نے کہا اور صدر دروازہ کھولنے لگے۔ کامران مرزا نے بچّوں کے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ وہ اندر سے بند تھا۔ انھوں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا:

"آفتاب! دروازہ کھولو۔ اندر کون ہے؟"

"ابا جان! ہم دروازہ نہیں کھول سکتے۔" آفتاب نے اندر سے کہا۔

"کیوں، کیا ہے؟" کامران مرزا تیزی سے بولے۔

"ہمارے کمرے میں ایک خوف ناک انسان موجود ہے، اور اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو بھی ہے۔ دروازہ خود اُس نے اپنے ہاتھ سے بند کیا ہے ——— ہم کھولنا چاہیں تو وہ ہمیں ایسا نہیں کرنے دے گا۔"

"وہ کیا چاہتا ہے؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا، کیوں کہ ...."

صدر دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی ایک گرج دار آواز نے ان سب کو ہلا کر رکھ دیا۔

"خبردار! کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے، ورنہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

کامران مرزا نے مُڑ کر دیکھا۔ دُوسرے ہی لمحے اُن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہاں تین لمبے تڑنگے نوجوان ہاتھوں میں پستول لیے کھڑے تھے۔ منوّر علی خاں کے ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھے ہوئے تھے۔

"ابّا جان، آپ کی طرف کیا بات ہے؟" آفتاب نے پُوچھا۔

"یہاں بھی تین آدمی پستول تانے کھڑے ہیں۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ یہ میرا گھر ہے یا بد معاشوں کا اکھاڑا۔ آفتاب! تم تینوں چُپ چاپ کھڑے رہو۔ کوئی غلط حرکت نہ کرنا۔ میں پہلے ان تینوں سے بات کر لوں۔"

"آپ بے فکر رہیں، ابّا جان۔"

کامران مرزا صدر دروازے کی طرف مُڑ گئے۔

"خبردار! اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھا کر ہمارے نزدیک آؤ۔"

"کیوں؟ اگر میں ہاتھ اُوپر اُٹھائے بغیر تمھارے نزدیک آگیا تو کیا تم پگھل جاؤ گے؟" کامران مرزا نے مُسکرا کر کہا۔ منوّر علی کی ہنسی نکل گئی، وہ بول اُٹھے:

"جیو میرے دوست۔ زندہ دل ایسے ہوتے ہیں۔ تین پستول اُٹھے ہوئے ہیں، لیکن خوف و ہراس کا چہرے پر دُور دُور تک نام و نشان نہیں۔ بھئی واہ! مزہ آگیا۔"

"کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔ ہمارے ہاتھوں میں جو پستول ہیں، وہ عام پستول نہیں ہیں۔" ایک پستول والا غرّا کر بولا۔

"تو پھر کیسے ہیں؟ موم کے بنے ہوئے ہیں یا لکڑی کے؟" کامران مرزا ہنسے۔

"یہ گیس کے پستول ہیں۔ ایک پستول چلنے کی دیر ہے کہ اس گھر میں موجود تمام لوگ موت کی نیند سو جائیں گے۔"

"اور ساتھ میں تم بھی۔" کامران مرزا بولے۔

"نہیں۔ ان پستولوں سے نکلنے والی گیس کا اثر ہم پر نہیں ہو گا۔"

"کیوں؟" کامران مرزا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ ہم تمھیں نہیں بتا سکتے۔ اس راز کو بتانے کی سزا سُرخ موت کی صورت میں ملتی ہے، جو اتنی خوف ناک ہے کہ اس کا خیال کرنے سے ہی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"بہت خوب! اور سزا تمھیں کون دیتا ہے؟"

"زیادہ باتیں نہ بگھارو۔ یہ بتاؤ، وہ کہاں ہے؟" ایک نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"وہ؟ کون وہ؟" کامران مرزا نے حیرت زدہ لہجے میں کہا، حال آں کہ وہ سارا معاملہ سمجھ گئے تھے۔

"وہ جو ابھی ابھی تمھارے مکان میں داخل ہوا ہے۔"

"کون داخل ہوا ہے؟ یہاں تو ہمارے سوا کوئی بھی نہیں۔ یا پھر ہمارے بچّے ہیں۔"

"ہوں۔ ہم اس گلی کا جائزہ لے چکے ہیں۔ صرف تمھارا گھر ایسا ہے جس میں وہ داخل ہو سکتا تھا۔"

"کیوں؟ دوسرے گھروں میں داخل ہونے سے اس کا دم گھٹ جاتا ہے؟"

"تم بہت بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہے ہو۔ سارے کس بل نکل جائیں گے، ذرا سی دیر میں۔"

"کس کے؟ تم تینوں کے؟" کامران مرزا مسکرائے۔

"تم نے شاید ان پستولوں کو غور سے نہیں دیکھا اور ہماری باتوں کو مذاق سمجھا ہے۔ اگر زندگی میں کبھی پستول دیکھا ہے تو ان کو غور سے دیکھو۔ تم سب اس وقت ہمارے رحم و کرم پر ہو۔ موت تم سے صرف چند انچ دور کھڑی ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی کامران مرزا نے پستولوں کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ حیران رہ گئے۔ پستول واقعی عجیب و

غریب شکل کے تھے۔ ان کی زندگی پستولوں سے کھیلتے گزری تھی۔ مختلف وقتوں میں ان کے پاس مختلف قسم کے پستول رہے تھے، لیکن اُنھوں نے اپنی زندگی میں اس قسم کے پستول واقعی نہیں دیکھے تھے۔ وہ ڈر گئے کہ کہیں یہ لوگ سچ ہی تو نہیں کہہ رہے، لیکن خوف کے آثار اُنھوں نے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیے۔ البتّہ مُنوّر علی خاں یہ باتیں سُن کر ضرور خوف زدہ ہو گئے تھے۔ ان کی نظریں بھی پستولوں پر جمی تھیں۔

پستول سے نکلنے والی گولی سے بچنے کا اِمکان تو ہوتا ہے لیکن گیس کے پستول سے بچنا ناممکن تھا۔ گیس، جو آناً فاناً پُورے مکان کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مُنوّر علی خاں خوف زدہ ہو گئے تھے، اگرچہ ان کی زندگی خوف ناک جنگلوں میں گزری تھی۔ اُنھوں نے شیروں اور چیتوں سے دست بہ دست مُقابلہ کیا تھا۔ بچھوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑے تھے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ زندگی میں کبھی خوف زدہ نہیں ہوئے، لیکن آج ان کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو گیا تھا۔

البتّہ کامران مرزا اب بھی کھڑے مُسکرا رہے تھے۔

اچانک ایک پستول والا کہنے لگا:

"اور یہ بھی نہ سمجھنا کہ ہم صرف تین ہیں۔ ہمارے تین ساتھی دروازے کے باہر بھی موجود ہیں۔ وہ پائیں باغ کی اس کھڑکی کی بھی نگرانی کر رہے ہیں، جس سے گزر کر وہ گھر میں داخل ہوا ہے۔ اب تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ اسے ہمارے حوالے کر دو۔ وہ ہمارا مجرم ہے۔ اس نے ہم سے غدّاری کی ہے۔ ہم اسے گرفتار کر کے لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر تم لوگوں نے اڑے آنے کی کوشش کی تو ہم اس کے ساتھ تمھیں بھی جہنّم میں پہنچا دیں گے۔"

"تم جہنّم کے بجائے جنّت کا لفظ استعمال نہیں کر سکتے تھے؟ بے وقوف آدمی، تم کون ہوتے ہو ہمیں جہنّم میں پہنچانے والے، جب کہ ہم نے اپنی تمام زندگی میں کوئی غلط کام نہیں کیا۔ ہم تو سیدھے جنّت میں جائیں گے، ہاں۔ کیوں مُنوّر علی خان؟" کامران مرزا نے انھیں باتوں میں اُلجھانے کے لیے کہا۔

"بالکل۔ جہنّم میں تو ہمارے سائے بھی نہیں جائیں گے۔" مُنوّر علی جلدی سے بولے۔

"ہاں، اور کیا۔ ویسے سُنا ہے، قیامت کے دن کسی

چیز کا سایہ نہیں ہو گا۔" کامران مرزا مُسکرائے۔

"چلو، خیر۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سایہ نہ ہو گا، تب بھی ہم جنّت میں ہی جائیں گے۔"

"انشاءاللہ۔" کامران مرزا نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ شاید وہ آسمان کی طرف دیکھنا چاہتے تھے۔

آنے والے لوگ انھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں جو موت کو اس قدر نزدیک پاکر بھی باتیں بنائے جا رہے ہیں۔ آخر ان میں سے ایک نے نرمی سے کہا:

"دیکھو، ہمیں تم سے کوئی دُشمنی نہیں ہے۔ ہم صرف اپنے ساتھی کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں، جس نے ہمارے ساتھ غدّاری کی ہے۔"

"تم اس کے ساتھ کیا سُلوک کرنا چاہتے ہو؟"

"ہمارے ہاں غدّاری کی سزا موت ہے، اور وہ بھی سُرخ موت۔" اس نے کہا۔

"تمھارے ہاں؟ کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔"

"یہ ہمارا اپنا مُعاملہ ہے۔ ہم اس کے بارے میں تمھیں کچھ نہیں بتا سکتے۔"

"خیر، نہ بتاؤ۔ لیکن تم اسے میری موجودگی میں گرفتار

کر کے نہیں لے جا سکتے۔"

"کیا مطلب؟" پستول والا چونکا۔

"پہلے یہ بتاؤ، تم کیا کام کرتے ہو؟"

"نہیں بتا سکتے۔" اس نے اکڑ کر کہا۔

"تب پھر مجھے افسوس ہے۔ میں مجبور ہوں۔ میں اسے تمھارے حوالے نہیں کر سکتا۔"

"کیا کہا؟ نہیں کر سکتے؟" پستول والے نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔

"ہاں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ میرے قبضے میں نہیں کہ اسے تمھارے حوالے کر دوں۔ اگر ہوتا، تب بھی نہ کرتا۔ لیکن اب تو میرے اپنے بچّے اس کے قبضے میں ہیں۔"

"کیا مطلب؟" تینوں شخص بُری طرح چونکے۔

کامران مرزا نے انھیں ساری بات بتا دی۔ وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر ان میں سے ایک بولا "کیا اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار بھی ہے؟"

"بچّوں کا کہنا ہے کہ اس کے ہاتھ میں کُھلا ہوا چاقو ہے۔" کامران مرزا نے کہا۔ تینوں کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر کامران مرزا اور منوّر علی خاں حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آئی کہ گیس کے تین تین پستولوں کی موجودگی میں وہ ایک ایسے شخص سے کیوں خوف زدہ ہو گئے جس کے پاس صرف ایک چاقو ہے۔

"حیرت ہے! تم اس سے ڈر گئے، جب کہ اس کے پاس صرف ایک چاقو ہے۔" کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں۔ اس کے مقابلے میں ہم نہتّے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ اس کے پاس چاقو نہیں ہو گا۔ وہ چاقو کا بہت بڑا ماہر ہے۔ شاید اس وقت پوری دُنیا میں اس سے زیادہ برق رفتاری سے کوئی چاقو نہیں پھینکتا۔ پستول کی گولی کی رفتار اس کے چاقو کی رفتار سے کہیں کم ہے۔ اور پھر ہمارے پاس جو پستول ہیں یہ تو اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔"

"وہ کیوں؟" منوّر علی خاں کے منہ سے نکلا۔

"جس طرح پستول کی گیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، اسی طرح وہ بھی محفوظ رہے گا، اور اتنی دیر میں اس کا چاقو کام کر جائے گا۔"

"پھر بھی، اس کے پاس ایک چاقو ہے اور تم تین ہو۔"

"نہیں۔ ایک چاقو ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس اور بھی چاقو ہوں گے۔ اس نے اپنے پاس پستول کبھی نہیں رکھا۔ البتہ چاقو ایک وقت میں کئی کئی رکھتا ہے۔"

"اوہ!" دونوں کے منہ سے نکلا۔ آخر کامران مرزا نے کہا "تب پھر تم لوگوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ اس سے ہم خود نپٹ لیں گے۔"

"یہ بھی نہیں ہو سکتا، کیوں کہ ہمیں جو حکم ملا ہے، ہم اس کے خلاف نہیں جا سکتے۔ ہمیں بہرحال اسے گرفتار یا ہلاک کرنا ہے۔ یا پھر خود اس کے ہاتھوں مر جائیں گے۔"

"تب پھر تم ہی بتاؤ، کیا کیا جائے؟" کامران مرزا نے بے بسی کے عالم میں شانے اُچکائے۔

اس وقت تک وہ موقع کی تلاش میں رہے تھے کہ کب وہ ذرا چوکیں اور کب وہ ان پر چھلانگ لگائیں؛ لیکن اُنھوں نے ایک پل کے لیے بھی اپنی نظریں ان پر سے نہ ہٹائی تھیں۔

"ہمیں اس کمرے کے دروازے پر لے چلو جس میں وہ موجود ہیں۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"ہم اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ شاید وہ ہتھیار ڈال دے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم دروازے پر چل کر اس سے بات کر سکتے ہو۔ لیکن خیال رہے کہ اندر ہمارے بچے بھی اس کے ساتھ موجود ہیں۔ اگر ان کو کوئی گزند پہنچا تو میں تم تینوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

کامران مرزا کی اس بات پر انھوں نے قہقہے لگائے۔ پھر ایک بولا "تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے پستول ہمارے ہاتھ میں نہ ہوں، تمھارے ہاتھ میں ہوں۔"

"تمھارے ان پستولوں کی اصلیت مجھ پر ظاہر ہو چکی ہے۔ ایک شخص کے چاقو کے مقابلے میں ان کی کیا وقعت ہے۔"

"وہ اس لیے کہ وہ ہمارا ساتھی ہے، اور جس طرح پستول کی گیس ہمارے لیے بے ضرر ہے، اسی طرح اس کے لیے۔ لیکن تم لوگوں کو تو یہ ایک سیکنڈ سے پہلے ختم کر دے گی۔"

"تمھارے نام کیا ہیں؟ کیا یہ بتانا پسند کرو گے؟"

"ہمارے نام نو، دس اور گیارہ ہیں۔"

"یہ کیسے نام ہیں؟" منوّر علی خان حیران ہو کر بولے۔

"ہمارے ہاں ناموں سے نہیں پکارا جاتا۔" نمبر نو نے کہا۔

"تو بھائی نو، دس، گیارہ، چلو دروازے پر اور کرلو اس سے جو باتیں تمھیں کرنی ہیں۔ کیوں کہ مجھے بڑے زور کی نیند آ رہی ہے، اور میرا خیال ہے منوّر علی خاں، تمھیں بھی نیند ستا رہی ہو گی۔" کامران مرزا نے لاپروائی سے کہا۔

"بالکل۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے اب گرا کہ گرا۔"

"ابھی نہ گرنا۔ ان لوگوں کو چلا جانے دو۔" کامران مرزا نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا۔ جب تم کہو گے، گر جاؤں گا۔" منوّر علی نے معصومیت سے کہا۔

نو، دس اور گیارہ نے انھیں بری طرح گھورا جیسے کچا ہی چبا جانا چاہتے ہوں۔

"تم دونوں بھی عجیب ہو۔ موت کو اس قدر نزدیک دیکھ کر بھی باتیں بنائے جا رہے ہو۔" نمبر دس نے کہا۔

"اب اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ایک طرف تین پستول ہیں جو عام پستولوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔ دوسری طرف ایک ایسا چاقو باز ہے جو پستول کی گولی سے زیادہ رفتار سے چاقو استعمال کرتا ہے۔ درمیان میں ہم ہیں۔ ان حالات میں ہم باتیں بنانے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔" کامران

مرزا بے بسی سے بولے۔

وہ دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ نو نمبر نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آفتاب کی آواز آئی:

"ابّا جان! کیا یہ آپ ہیں؟"

"ہاں، بیٹا میں بھی ہوں، اور تمھارے چچا بھی۔ لیکن ہمارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو تمھارے اس اجنبی سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے تم خیریت سے تو ہو؟ اس شخص نے تمھیں کچھ کہا تو نہیں؟ تمھیں ڈرایا دھمکایا تو نہیں؟ اگر ڈرایا ہے تو بے فکر رہو۔ میں اسے اتنا ڈراؤں گا کہ یہ ساری زندگی ڈرنے سے ڈرے گا اور اگر اس نے تمھیں دھمکایا ہے تو میں اس قدر دھمکاؤں گا کہ ساری زندگی کسی کو دھمکی نہیں دے گا۔ اب میں خاموش ہوتا ہوں اور ان کو باتیں کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔"

نو، دس اور گیارہ نے بُرا سا منھ بنایا اور پھر دروازے کے پاس آئے۔ نمبر نو نے دروازے کو تین مرتبہ کھٹ کھٹایا۔ پھر قدرے بلند آواز میں کچھ کہا۔

کامران مرزا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا، کیوں کہ جس زبان میں اس نے بات کی تھی، وہ انھوں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ دوسری طرف منوّر علی خاں

پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیکن دونوں کی حیرت کی وجہ جدا جدا تھی۔ منوّر علی خاں کی سمجھ میں وہ الفاظ آ گئے تھے۔ انھوں نے کامران مرزا کا بازو پکڑ کر کہا اور بولے:

"میں یہ زبان جانتا ہوں۔"

یشوما

وہ تینوں، جن کے نام نو، دس اور گیارہ تھے، مُنوّر علی خاں کے الفاظ سُن کر چونک اُٹھے۔ نمبر نو نے پریشان ہو کر کہا:

"تو تم یہ زبان جانتے ہو؟"

"ہاں، جانتا ہوں۔ میں نے افریقہ کے جنگلوں میں بہت زندگی گزاری ہے، اور وہاں کے جو قبائلی باشندے ہیں، ان کی قید میں بھی رہا ہوں۔ وہیں مجھے یہ زبان سیکھنے کا موقع ملا۔ معلوم ہوتا ہے کمرے کے اندر کوئی افریقی قبائلی موجود ہے۔"

"تم ٹھیک سمجھے۔ لیکن یہ تو بتاؤ، ہم نے کیا کہا ہے؟"

"تم شاید میرا امتحان لینا چاہتے ہو۔ میں بتائے دیتا ہوں۔ تم نے اس شخص سے کہا ہے کہ یشوما! تمھاری موت تمھارے سر پر پہنچ چکی ہے۔ سُرخ موت!"

"اوہ! واقعی تم تو یہ زبان جانتے ہو۔ خیر، دیکھا جائے

گا۔ ویسے یہ بھی ایک حیرت انگیز اِتّفاق ہے کہ یشوما ایک ایسے گھر میں گھسا، جس میں اس کی زبان سمجھنے والا بھی موجود ہے۔ اور.... اور یہ بہت خطرناک بات ہے۔ اب تمھیں زندہ نہیں چھوڑا جا سکتا۔ کیوں کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفت گو تم سمجھ لو گے۔"

"اس میں میرا کیا قصور۔ تم کسی اور زبان میں بات کر لو نا۔ میں نے تمھیں منع کیا ہے۔" مُنوّر علی خان نے گھبرا کر کہا۔

"مصیبت تو یہی ہے۔ یشوما کوئی اور زبان جانتا ہی نہیں۔"

"لو بھئی، مُنوّر علی۔ تمھاری تو آگئی شامت۔" کامران مرزا مُسکرائے۔

"تم مجھے اس پستول سے مارو گے؟" مُنوّر علی نے پریشان ہو کر کہا۔

"مجبوری ہے۔ اس ہتھیار کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چیز نہیں۔ اور پھر اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آواز پیدا نہیں ہوتی۔ ٹرائیگر دبایا، گیس کی ایک پتلی سی دھار نکلی اور تم سب لمبے لمبے لیٹے نظر آؤ گے۔"

"لیکن ہم نے کیا کیا ہے؟ ہمارا قصور کیا ہے؟" مُنوّر علی

خاں نے گھبرا کر کہا۔

در اصل وہ ان کو باتوں میں لگا کر موقع کی تلاش میں تھے۔ کامران مرزا نے بھی انھیں اشارہ کیا تھا کہ جس قدر باتیں کر سکو، کرتے رہو۔

"تم نے یہ قصور کیا ہے کہ یشوما کو پناہ دی ہے اور سونے پر سہاگا یہ کہ اس کی زبان بھی جانتے ہو۔" نمبر نو نے بتایا۔

"بھئی واہ! تم تو بہت با محاورہ اُردو بول لیتے ہو۔" منوّر علی خاں نے کہا۔

"اچھا، اب ذرا ہمیں اس سے بات کرنے دو۔" نمبر دس نے جھلّا کر کہا۔

اب پھر ان کے رُخ دروازے کی طرف ہو گئے۔ لیکن اس حالت میں بھی ان کے پستولوں کی نالیں ان دونوں کی طرف اُٹھی رہیں۔ نمبر نو کچھ کہہ رہا تھا۔ کامران مرزا نے سوالیہ نظروں سے منوّر علی خاں کی طرف دیکھا۔ وہ ان کا مطلب سمجھ گئے اور ساتھ ساتھ ان کی گفت گو کا ترجمہ کرتے لگے۔ ان کی آواز بھی کافی اُونچی تھی تاکہ کمرے کے اندر بچّے بھی سُن لیں۔ ان کے درمیان ہونے والی گفت گو یہ تھی:

"یشوما، ہم چھ ہیں۔ تم اکیلے ہو۔ بہتر یہی ہے کہ تم خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔ صرف آگے لے جا کر پیش کر دیں گے۔"

"میں جس مقصد کے لیے نکلا ہوں، ابھی وہ پُورا نہیں ہوا۔ میں نے اپنی جان کی بازی لگائی ہے تو پھر اس کام کو پُورا کر کے ہی چھوڑوں گا۔ اس کے بعد اگر تم مجھے زندہ پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تو جو جی میں آئے کرنا۔ فی الحال میں خود کو تمھارے حوالے کرنے کو تیار نہیں۔" یشوما نے کہا۔

"ہمیں نہیں معلوم کہ تم نے غدّاری کیوں کی ہے، اور تم کس مقصد کو سامنے رکھ کر نکلے ہو۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ہمیں تمھیں گرفتار کرنے کا حکم ملا ہے اور یہ بھی کہ اگر گرفتار نہ کر سکیں تو ختم کر دیں۔" نمبر نو نے کہا۔

"تم مجھے کس طرح گرفتار کر سکتے ہو، جب کہ تمھارے پاس جو پستول ہیں وہ میرے لیے کھلونوں سے زیادہ اہمیّت نہیں رکھتے اور میرے ہاتھ میں چاقو ہے، جس کی دھار پر تمھاری موت کھیل رہی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس گھر سے نکل جاؤ اور مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع دے دو، ورنہ تم چھ میں سے شاید ہی کوئی زندہ بچے۔" یشوما نے بڑے رعب

سے کہا۔

تینوں بچے چُپ چاپ ان کی گفت گو سُن رہے تھے۔ وہ حیران تھے کہ یہ سب کیا ہے! یہ اجنبی کس قسم کا آدمی ہے جو بیک وقت چھ آدمیوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے، جب کہ اس کے پاس کوئی خطرناک ہتھیار بھی نہیں۔ صرف ایک چاقو ہے۔ کہیں اس کا دماغ تو خراب نہیں! یہ کہاں سے آیا ہے؟ کیا مقصد لے کر نکلا ہے؟ اس کا پیچھا کرنے والے کون ہیں؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات تینوں بچوں کے ذہنوں میں گونج رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں کی گفت گو بھی سُن رہے تھے۔ یشوما کی بات کا جواب کچھ لمحوں تک کوئی نہ دے سکا۔ آخر نمبر نو بولا:

"یشوما! تم ایک بات بھول رہے ہو؟"

"جو بات میں بھول رہا ہوں وہ تم یاد دلا دو۔"

"سُرخ موت!" نمبر نو نے پُراسرار لہجے میں کہا۔

"سُرخ موت!" یشوما کے مُنھ سے نکلا۔

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ شاید سبھی سُرخ موت کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ یہ گفت گو بھی عجیب ماحول میں ہو رہی تھی۔ پہلے نمبر نو، دس یا گیارہ کوئی بات

کرتا اور مُنوّر علی خاں فوراً ہی اس کا ترجمہ کرتے۔ پھر یشوما جواب دیتا اور مُنوّر علی خاں اس کی بات کا ترجمہ کرتے۔ نمبر نو، دس اور گیارہ بڑے صبر سے یہ سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔ کامران مرزا بھی سمجھ گئے تھے کہ کسی وجہ سے وہ لوگ اُن سے اُلجھنا نہیں چاہتے، شاید اس وقت تک جب تک یشوما پر قابو نہ پا لیں۔ سُرخ موت کا لفظ ان کی گفت گو میں پہلے بھی آ چکا تھا۔ وہ حیران تھے کہ یہ سُرخ موت کیا بلا ہے! یہ کس قسم کی موت ہے جس کا نام لے کر وہ یشوما کو ڈرا رہے تھے! اُنھوں نے سُنا، مُنوّر علی خاں یشوما کی بات کا ترجمہ کر رہے تھے:

"اگر سُرخ موت کا خطرہ نہ ہوتا تو میں اس وقت بند کمرے میں تم سے گفت گو نہ کر رہا ہوتا۔ پھر بھی میں خوف زدہ نہیں ہوں، کیوں کہ میرے ہاتھ میں چاقو موجود ہے۔"

"تب پھر تیار ہو جاؤ۔ ہم حملہ کرنے لگے ہیں۔" نمبر دس نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔

"اب مقابلہ ایک چاقو اور سُرخ موت کا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم میں سے ایک دو کم ہو جائیں گے لیکن اتنی دیر میں سُرخ موت اپنا کام کر جائے گی۔" نمبر دس نے کہا۔

یشوما نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید وہ سوچ میں پڑ گیا

تھا کہ کیا کرے۔ کامران مرزا اور منوّر علی خاں بھی اپنے ذہنوں کو تیزی سے گردش دے رہے تھے لیکن ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا۔ آخر کامران مرزا بولے۔

"آؤ بھائی منوّر علی خاں، ہم چل کر سوئیں۔ یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ لیکن بچّوں کا کیا کریں؟"

"مسٹر نمبر نو، ہم چاہتے ہیں کہ بچّوں کو لے کر یہاں سے الگ ہٹ جائیں تاکہ تم ایک دُوسرے سے سمجھ لو۔ تم چند منٹ کے لیے یہاں سے نکل جاؤ تاکہ ہم بچّوں کو باہر نکال لیں۔"

"خبردار! اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ اب تم ہمارے راز سے واقف ہو گئے ہو۔ ہم تمھیں نہیں چھوڑ سکتے.... جو کچھ...."

اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ صدر دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ سب نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر نمبر گیارہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازے پر پہنچا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ دُوسرے ہی لمحے کامران مرزا بُری طرح چونکے۔

دروازے میں سے ہوتے ہوئے سب انسپکٹر خالد اور تین کانسٹیبل اندر آ رہے تھے۔ لیکن اس حالت میں کہ اُن کے ہاتھ اُوپر اُٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے ایک اور شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گیس پستول تھا۔

"نمبر بارہ یہ سب کیا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟" نمبر نو نے پُوچھا۔

"یہ اندر داخل ہونے والے تھے۔ میں نے سوچا اندر نہ جانے کیا حالات ہوں، اس لیے انھیں پستول کی زد میں لے کر اندر پہنچا دیا" نمبر بارہ نے بتایا۔

"بہت خوب! تم نے اچھا کیا۔ اچھا دیکھو، ایک آدمی پائیں باغ والی کھڑکی کے نیچے موجود رہے، اور دو دروازے پر رہیں۔ اب ہم حملہ کرنے والے ہیں۔ ان لوگوں سے ہم نپٹ لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر مدد کی ضرورت پڑے تو اشارہ دے دینا۔ ہم پہنچ جائیں گے۔" نمبر بارہ نے کہا۔

"لیکن صرف دو آنا۔ ایک ہر حال میں پائیں باغ میں ٹھہرے۔ کیوں کہ یشوما اسی کمرے میں بند ہے۔ ہو سکتا ہے وہ باغ کے راستے فرار ہونے کی کوشش کرے۔"

"بہت اچھا" نمبر بارہ نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ نمبر گیارہ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"ہیلو انسپکٹر! تم بھی آ پہنچے۔" کامران مرزا مسکرائے۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ حالات اس قدر سنگین ہوں گے۔ مجھے تو فضلو نے فون پر بتایا تھا کہ کوئی خوف ناک آدمی اندر گھس آیا ہے۔"

"اوہ! فضلو!" کامران مرزا کے منہ سے نکلا۔

فضلو کا خیال تو اُن کے ذہن سے نکل ہی گیا تھا۔ خوف ناک آدمی کے متعلق انھیں اسی سے معلوم ہوا تھا۔ وہ دوڑ سے آ رہے تھے کہ صدر دروازے پر دستک ہوئی تھی اور نمبر نو، دس اور گیارہ اندر گھس آئے تھے۔ اُس وقت سے اِس وقت تک فضلو کا خیال اُنھیں آیا ہی نہ تھا۔

"یہ فضلو کون ہے؟ کیا گھر کا ملازم ہے؟" نمبر نو نے پوچھا۔

"ہاں۔" کامران مرزا نے کہا۔

"نمبر گیارہ، تم جا کر فضلو کو پکڑ لاؤ۔ کہیں وہ کسی اور کو فون نہ کر رہے۔ اور ہاں، ٹیلے فون کے تار کاٹ دینا۔"

"اچھا۔" نمبر گیارہ نے کہا اور برآمدے میں سے ہوتا ہوا اندر چلا گیا۔

جلد ہی فضلو بھی وہاں موجود تھا، اور بُری طرح سہما ہوا تھا۔ کامران مرزا اس دوران میں سب انسپکٹر خالد

کو گیس پستولوں کے بارے میں بتا چکے تھے تاکہ وہ بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم نہ اُٹھائے۔

"ہم سب کھڑے کھڑے تھک چکے ہیں۔ بہت دیر سے کھڑے ہیں نا۔ کیوں نہ بیٹھ جائیں۔ نہ جانے کب تم لوگوں کی چیقلش ختم ہو گی۔" کامران مرزا نے کہا اور بیٹھنے لگے۔

"نہیں۔ کھڑے رہنا ہو گا۔ بس اب ہم کام شروع کرنے لگے ہیں۔" نمبر نو نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو دروازہ توڑنے کا اشارہ کیا۔

"یشوما! ہم آخری بار تمھیں تنبیہہ کرتے ہیں۔ دروازہ کھول کر باہر نکل آؤ ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔"

"ضرور توڑ دو" یشوما نے بے فکری سے کہا "جُوں ہی دروازہ ٹوٹے گا، میرا چاقو تم میں سے کسی ایک کے جسم کے پار ہو گا۔"

"کوئی پروا نہیں" نمبر نو نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو اِشارہ کیا۔

دونوں ایک ساتھ دروازے پر کندھے مارنے لگے۔ پندرہ منٹ تک مسلسل ٹکریں مارنے کے بعد دروازے میں چرچراہٹ ہوئی۔ کامران مرزا سمجھ گئے کہ مزید دس منٹ کی کوشش

دروازے کو دوسری طرف گرا دے گی۔ اُنھوں نے دروازے کا جائزہ لیا۔ پھر دروازے کے سامنے دیکھا۔ وہ جانتے تھے کہ جُوں ہی دروازہ کُھلے گا، اندر سے چاقو پھینکا جائے گا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر اُنھوں نے پہلے مُنوّر علی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ بات سمجھائی اور اشارے سے وہ جگہ بتائی جہاں خطرے کے وقت اُنھیں لیٹنا تھا۔ اسی طرح اُنھوں نے انسپکٹر خالد اور فضلو کو بھی سمجھا دیا۔ اس طرح وہ سب صُورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

دروازہ اب ہچکولے کھانے لگا تھا۔ اچانک کامران مرزا کے منھ سے نکلا "میں اس دروازے کی قیمت تم سے ضرور وصول کروں گا۔"

کمرے کے اندر آفتاب، آصف اور فرحت چُپ چاپ کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے اجنبی دروازے کو گھُور رہا تھا۔

"یہ ہم بیٹھے بٹھائے کس مُصیبت میں گرفتار ہو گئے۔" فرحت بولی۔

"ابھی تک تو یہ مُصیبت ہماری سمجھ میں آئی نہیں۔ خُدا جانے یہ صاحب کیا چاہتے ہیں، اور یہ کون ہیں جو ان کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے ہیں اور اب دروازہ توڑنے

پر تُلے ہوئے ہیں۔" آصف بولا۔

"یہ سوچو کہ دروازہ ٹوٹنے کے بعد کیا ہو گا۔ ان کے درمیان یقیناً جنگ ہوگی۔ ایک خوف ناک جنگ۔ اس جنگ میں ہم کیا کریں گے؟"

"جب تک ہمیں اس جنگ کا مقصد معلوم نہیں ہو جاتا، ہم غیر جانب دار رہیں گے۔" آصف نے مشورہ دیا۔

"یہ تو ٹھیک ہے، لیکن ان میں سے کوئی شخص تو ضرور حق پر ہے، اور ہمیں صرف اس کا ساتھ دینا چاہیے جو حق پر ہے۔"

"لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ حق پر کون ہے، ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے؟"

"کاش! یہ ہماری زبان جانتا۔ اس وقت ضرور ہم کچھ نہ کچھ کر سکتے تھے۔"

"ابھی تک یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کا تعلّق ہمارے مُلک سے ہے یا کسی دُوسرے مُلک سے۔" فرحت بولی۔

"کم از کم یہ شخص تو غیر مُلکی ہے۔ جو باہر موجُود ہیں، وہ چوں کہ اُردو بھی بول سکتے ہیں اس لیے کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ ہمارے مُلک کے ہیں یا کسی اور مُلک کے۔ ویسے زیادہ اِمکان اس بات کا ہے کہ وہ ہمارے ہی

مُلک کے رہنے والے ہیں۔" آصف نے کہا۔

"اس صُورت میں ہمیں ان کا ساتھ دینا چاہیے، نہ کہ اُس کا۔" فرحت نے کہا۔

"یہ ضروری نہیں۔ بعض اوقات اپنے وطن میں بھی وطن کے دُشمن موجُود ہوتے ہیں اور کئی غیر مُلکی وطن دوست ثابت ہوتے ہیں۔"

"اب کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کون ہمارے مُلک کا دوست ہے اور کون دُشمن۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دونوں مُلک کے دُشمن ہوں اور آپس میں بھی دُشمن ہوں، جیسا کہ ان کی گُفت گُو سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ پہلے ساتھی رہے ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ بس تو فیصلہ ہوا کہ ہم کسی کا ساتھ نہیں دیں گے۔"

"دروازہ ٹُوٹنے کے قریب ہے۔ ہمیں اپنے بچاؤ کی تدبیر کر لینی چاہیے۔"

"ہُوں۔" آصف نے کہا اور تینوں بچاؤ کے متعلق سوچنے لگے۔

اچانک اُنھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اجنبی نے چاقُو کو بائیں ہاتھ میں پھل کی نوک سے پکڑ لیا تھا۔ پھر اس

کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں رینگ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے جیب سے ایک اور لمبے سے پھل والا چاقُو نکالا اور اسے بھی بائیں ہاتھ میں نوک کی طرف سے پکڑ لیا۔ پھر تیسرا چاقُو بھی نکلا اور اب اس کے بائیں ہاتھ میں تین چاقُو موجُود تھے۔

دروازہ کسی بھی لمحے ٹُوٹنے والا تھا۔ یہ دیکھ کر تینوں گھبرا گئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یشوما اپنے دُشمنوں پر چاقُو پھینکنے کا اِرادہ رکھتا ہے۔ اُنھوں نے سوچا، کمرے سے باہر گھر کے دُوسرے لوگ بھی موجُود ہیں۔ خدا ناخواستہ چاقُو ان میں سے کسی کے لگ گیا تو کیا ہو گا۔ اس خیال کے آتے ہی آصف کے مُنھ سے نکلا:

"مسٹر یشوما، کمرے سے باہر تمھارے دُشمنوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ موجُود ہیں۔ اگر چاقُو ان میں سے کسی کے لگ گئے تو کیا ہو گا؟ کیا تمھارے دل میں ذرا بھی رحم اور ہمدردی نہیں ہے؟"

یشوما نے اپنا نام سُن کر اُن کی طرف مُڑ کر دیکھا، لیکن اس کی آنکھوں میں سوال دیکھ کر آصف کو یاد آیا کہ وہ تو اُردو سمجھتا ہی نہیں۔ آفتاب نے اس سے اِشاروں میں بات کرنے کی کوشش کی۔ اس نے چاقُوؤں کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے اسے سمجھایا کہ وہ ان سے اپنے دشمنوں پر حملہ نہ کرے۔ یشوما اس کی بات سمجھ کر مسکرا اٹھا اور ہاتھ کے اشارے سے کہنے لگا کہ بے فکر رہو۔ تمھارا کوئی عزیز ان چاقوؤں کی زد میں نہ آئے گا۔

اچانک دروازہ دھڑام سے کمرے کے اندر آ گرا۔

ٹکراؤ

اور پھر پلک جھپکتے ہی تین باتیں ہوئیں۔ دروازے کے گرتے ہی یشوما کا چاقوؤں والا ہاتھ بجلی کی سی سرعت سے اٹھا، ساتھ ہی آصف نے اپنی جگہ سے یشوما کی طرف چھلانگ لگائی اور اس کی کمر سے ٹکرایا۔ تین چاقو فضا میں سے ہوتے ہوئے برآمدے میں جا گرے۔ برآمدے میں سب لوگ پہلے ہی زمین پر لیٹ چکے تھے۔

آصف کے دھکّے کی وجہ سے یشوما کا نشانہ چوک گیا، ورنہ زمین پر لیٹ جانے کے باوجود نمبر نو، دس اور گیارہ کا بچنا ناممکن تھا۔

جوں ہی چاقو برآمدے کے فرش سے ٹکرائے، کامران مرزا اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔ اس سے اچھا موقع انھیں ساری زندگی نہیں مل سکتا تھا۔ وہ زمین پر لیٹے ہوئے نمبر نو اور دس کے اوپر جا گرے۔ منور علی خان نے یہ دیکھا تو وہ نمبر گیارہ سے لپٹ گئے۔

جو ان کے قریب ہی زمین پر لیٹا تھا۔

کامران مرزا کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح گیس پستول ان کے ہاتھوں سے چھین لیں۔ دوسری طرف منوّر علی خاں بھی اسی کوشش میں تھے، لیکن پستول چھوڑنے پر وہ کسی طرح بھی تیار نہ تھے۔

اتنی دیر میں دوسرے بھی ہوش میں آ چکے تھے۔ سب انسپکٹر خالد اور اس کے ساتھی کانسٹیبل تیزی سے اُٹھے۔ انھیں اور تو کچھ نہ سوجھا، ایک ایک زور دار ٹھوکر ان تینوں کے سروں پر رسید کر دی۔ پل بھر کے لیے ان کی گرفت پستولوں پر ہلکی پڑ گئی اور کامران مرزا اور منوّر علی خاں پستول چھین لینے میں کامیاب ہو گئے۔

حالات نے کچھ اس قدر تیزی سے پلٹا کھایا تھا کہ سب پتھّر کے بتوں کی طرح اپنی اپنی جگہ پر کھڑے یا بیٹھے رہ گئے۔ پستولوں پر قبضہ کرنے کے بعد کامران مرزا نے سب سے پہلے کمرے کے اندر نظر ڈالی۔ لیشوما کو دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئے۔ وہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اسے شاید اپنے نشانے کے خطا جانے کا خیال ستا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ اس کے پیچھے آفتاب، آصف اور فرحت کھڑے تھے۔

"حیرت ہے! تم لیشوما کو دُنیا کا بہت بڑا چاقو باز کہہ رہے تھے۔ اس کا تو ایک بھی چاقو نشانے پر نہیں لگا" کامران مرزا نے نمبر نو سے کہا۔

"میں خود بھی حیران ہوں۔ آج تک ایسا نہیں ہوا۔" نمبر نو بولا۔

"اس میں قصور لیشوما کے نشانے کا نہیں ہے۔ یہ کارنامہ تو دراصل آصف نے انجام دیا ہے۔" آفتاب نے انھیں بتایا۔

اب وہ سب ڈرائنگ رُوم میں آ چکے تھے۔ کامران مرزا نے ان سب کو بیٹھ جانے کے لیے کہا اور آصف کی طرف دیکھ کر بولے:

"کیا مطلب؟ تم نے کیا کیا تھا آصف؟"

"ج..... جی انکل..... م..... میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ بس ذرا لیشوما کی کمر سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ بھی اس خیال سے کہ آپ میں سے کوئی زخمی نہ ہو جائے۔"

"بہت خُوب! تم نے کمال کر دیا، آصف۔ میں ان لوگوں سے نپٹنے کے بعد تمھیں کم از کم پچاس روپے انعام دُوں گا۔"

"ابا جان، ایک ذرا سا دھکا لگانے کے پچاس روپے

ہم یشوما کی کمر کو دو دو دھکّے لگانے کو تیّار ہیں۔"
آفتاب نے بُرا سا مُنھ بنا کر کہا۔
"تم تو صرف باتیں ہی بناتے رہ جاتے ہو اور آصف کام دکھا جاتا ہے۔"
"در اصل میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ان دونوں میں ہمارا دوست کون ہے اور دُشمن کون۔" آفتاب نے کہا۔
"یہ تو ابھی تک ہمیں بھی معلوم نہیں، لیکن آصف کے ایک ذرا سے کام نے پُوری بساط اُلٹ کر رکھ دی ہے۔ اب یہ دونوں ہی ہمارے قبضے میں ہیں۔ ہم ان سے سب باتیں معلوم کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر حالات مختلف ہوتے تو ہم ہر طرح سے نقصان میں رہتے۔"
"ہوں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ چلیے، اس مرتبہ سہرا آصف کے سر ہی باندھ دیجیے۔ میں اور فرحت جلد ہی کوئی کام دکھا دیں گے۔ یہ چکّر تو کچھ لمبا نظر آتا ہے۔"
"اچھا، اب ذرا مجھے ان سے بات کر لینے دو۔" کامران مرزا نے کہا اور نمبر نو، دس اور گیارہ کی طرف مُتوجّہ ہوئے۔
"ہاں بھئی، اب کہو، کیا کہتے ہو۔ تمھارے یہ خطرناک ہتھیار اب ہمارے قبضے میں ہیں۔"

"یہ ہمارے لیے خطرناک نہیں۔ صرف تمھارے لیے ہیں۔"
"چلو خیر، یُوں ہی سہی۔ انسپکٹر خالد، تم ذرا اپنا پستول نکال کر ان لوگوں کو دکھا دو۔ کہیں تمھیں یہ نقلی انسپکٹر نہ سمجھ رہے ہوں۔"
خالد نے پستول نکال کر اُن کی طرف تان دیا اور گرج کر بولا:
"اگر تم میں سے کسی نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت کی تو میرے پستول کی گولی اس کا بھیجا اُڑا دے گی۔"
"انسپکٹر خالد، تم ان لوگوں کی تلاشی لو اور جو کچھ ان کی جیبوں سے برآمد ہو، ایک جگہ ڈھیر کرتے رہو۔"
"جی، بہت بہتر۔" انسپکٹر خالد نے کہا اور سب سے پہلے نمبر نو کی طرف بڑھا۔ اس کی جیب سے دو سو روپے برآمد ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی شیشی جس میں زرد رنگ کی کوئی چیز تھی۔ کسی چمک دار دھات کی ایک چوکور ڈبیا بھی برآمد ہوئی۔ انسپکٹر کامران مرزا نے شیشی کو بغور دیکھا لیکن جان نہ سکے کہ اس میں کیا چیز ہے۔ پھر اُنھوں نے دھات کی ڈبیا کو اُٹھا کر دیکھا۔ وہ حیران رہ گئے۔ یہ نہ لوہے کی تھی، نہ پیتل یا تانبے کی۔ یہ کسی ایسی دھات کی تھی جو اُنھوں نے آج تک نہیں دیکھی

تھی۔ اس کا رنگ سُنہری مائل نیلا تھا۔

نمبر دس کی جیب میں سے پچاس کے قریب روپے اور اسی قسم کی ایک شیشی اور ڈبیا برآمد ہوئی۔ وہ سب حیران رہ گئے جب تیسرے کی جیب سے بھی ایسی ہی شیشی اور ڈبیا نکلی۔

"مسٹر نمبر نو، کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ ان شیشیوں میں کیا ہے اور یہ ڈبیاں کیا بلا ہیں؟"

"ہم اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔" نمبر نو نے بے پروائی سے کہا۔

"مُنوّر علی، تم یشوما سے پُوچھو۔ یہ کیا چیزیں ہیں؟"

مُنوّر علی نے یشوما سے سوال کیا اور اس کا جواب سُن کر کہنے لگے:

"کہتا ہے، اسے بالکل معلوم نہیں کہ یہ کیا چیزیں ہیں۔"

"تو کیا یشوما جھوٹ بول رہا ہے؟" کامران مرزا بولے۔

"شاید یہی بات ہے۔ وہ بتانا نہیں چاہتا۔"

"خیر، کوئی بات نہیں۔ مسٹر نمبر نو، اب تم بتاؤ، تم لوگ لوگ کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور تمھارا تعلق کس جماعت سے ہے۔ اور یہ کہ تم نے میرے گھر کو اکھاڑا کیوں سمجھ لیا ہے؟ میں یہاں اِس قسم کے دنگل کرانے کا

شوقین نہیں ہوں۔ اگر تم نے میری باتوں کا جواب نہ دیا تو تمھیں جیل کی ہوا کھانی ہو گی، کیوں کہ تم غیر قانونی طور پر میرے گھر میں گھسے ہو۔ اب تم خود سوچ لو کہ تمھیں کیا کرنا چاہیے۔ جیل جانا پسند کرو گے یا سب کچھ بتانا؟ ویسے اگر تم سب کچھ بتانے کے بعد مُجرم نظر آئے تو رعایت تمھارے ساتھ پھر بھی نہیں کی جائے گی۔" کامران مرزا بولتے چلے گئے۔

"تم خواہ کوئی بھی ہو، ہماری زبان سے ایک لفظ بھی نہ اُگلوا سکو گے۔ رہی جیل، تو وہ ہمیں اپنے اندر نہیں رکھ سکے گی۔"

"کیوں؟ تم اتنے ثقیل ہو؟" کامران مرزا نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"ہاں۔ ہم یہاں سے بھی بڑی آسانی سے چلے جائیں گے اور تم ہمیں روک نہ سکو گے۔"

اچانک کامران مرزا کو یاد آیا کہ ان کے تین ساتھی ابھی گھر سے باہر موجود ہیں۔ کہیں یہ انھی کی وجہ سے تو بڑھ چڑھ کر باتیں نہیں بنا رہا۔ بات تھی بھی ٹھیک۔ باہر موجود تینوں آدمیوں کے پاس گیس پستول تھے اور وہ انھیں نقصان پہنچا سکتے تھے۔

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ان تینوں پر قابو پانا بہت ضروری تھا، ورنہ وہ سب خطرے میں تھے۔ انھیں یاد آیا، انسپکٹر خالد کو اندر لانے والے نے نمبر نو سے کہا تھا کہ اگر وہ خطرے میں ہوں تو اشارہ کر دیں۔ لیکن وہ اندر تو اس وقت آ سکتے ہیں جب دروازہ کھلا ہوتا اور دروازہ نمبر نو نے بند کر دیا تھا۔ فی الحال ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ پھر بھی ان کا انتظام کرنا ضروری تھا۔

"انسپکٹر خالد، تم ان چاروں کو پستول کے نشانے پر رکھو۔ میں جانتا ہوں تمھارا نشانہ بہت پختہ ہے اور تمھارے پستول میں چھ گولیاں موجود ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ذرا سی بھی حرکت کرنا چاہے یا حلق سے کوئی آواز نکالے، تو بے دریغ گولی مار دینا۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر کامران مرزا نے تینوں گیس پستول اُٹھا لیے۔ البتہ شیشیاں اور ڈبیاں وہیں رہ گئیں۔ انھوں نے منور علی، آفتاب، آصف اور فرحت کو اشارہ کیا۔ وہ چاروں بھی ان کے پیچھے کمرے سے نکل گئے۔

اپنے کمرے میں آ کر انسپکٹر کامران مرزا بولے:

"معاملہ ابھی تک میرے پلّے نہیں پڑا۔ خدا جانے چکّر کیا ہے! لیکن خیر، یہ تو بعد میں پتا چلاتے رہیں گے

اس وقت جو سب سے ضروری کام ہے وہ ان تینوں کو گرفتار کرنا ہے جو گھر کے باہر موجود ہیں۔ اگر ان کے پاس گیس پستول نہ ہوتے تو فکر کرنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن یہ پستول ہمارے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ اب ہمارے پاس بھی تین گیس پستول ہیں لیکن یہ ہمارے لیے بالکل بے کار ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح ان تینوں کو گرفتار کر لیا جائے۔"

"لیکن ہم مکان سے باہر نکلے بغیر انھیں کس طرح گرفتار کر سکتے ہیں؟" منور علی خاں بولے۔

"وہ لوگ صدر دروازے پر موجود ہیں۔ اگر ہم کسی طرح مکان کی پشت پر اُتر جائیں تو ان پر قابو پایا جا سکتا ہے۔" آصف نے کہا۔

"اور مکان کی پشت پر اُترنا ہمارے لیے کیا مشکل ہے۔ بس چھت پر چڑھ کر نیچے چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ بغیر کسی دقت کے نیچے پہنچ جائیں گے۔" آفتاب نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"تو پھر تم ہی کوئی ترکیب بتاؤ۔" آصف نے مسکرا کر کہا۔

"میں کیوں بتاؤں۔ ترکیب بتائے گی فرحت، اور ہم

اس پر عمل کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ چھت کے ذریعے کوئی رسّی نیچے لٹکا دی جائے تو اس کے سہارے نیچے اُترا جا سکتا ہے۔ ویسے تو پانی کا پائپ بھی موجود ہے، لیکن اس کے ذریعے نیچے اُترنے میں خطرہ ہے۔ پائپ ہاتھوں سے چھوٹ جائے تو بقول آفتاب فوراً ہی نیچے پہنچ جائیں گے۔" فرحت نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"تو تم یہ چاہتی ہو کہ میں اور آصف رسّی کی مدد سے نیچے اُتریں اور اُن پر قابو پالیں؟"

"ہاں، کچھ نہ کچھ تو کر کے دکھانا ہوگا۔"

"اچھا، ٹھیک ہے۔ ابّا جان، آپ لوگ واپس چلے جائیں۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ باہر والوں سے ہم نپٹ لیں گے۔"

"ہماری مدد کے بغیر تم یہ کام کرو گے؟" کامران مرزا نے پُوچھا۔

"جی ہاں۔ انشا اللہ ہم صدر دروازے کے راستے اندر داخل ہوں گے۔"

"چلو بھائی مُنوّر علی خاں، ہم وہیں چلتے ہیں۔ باہر والوں کو یہ خود ہی سنبھال لیں گے۔" کامران مرزا نے ہنستے

ہوئے کہا۔

"لیکن یہ ان تینوں پر کیسے قابو پائیں گے؟"

"یہ ان کا کام ہے، اور ایسے کام یہ پہلے بھی کر چکے ہیں۔"

"اور فرحت کیا کرے گی؟" مُنوّر علی خان نے پُوچھا۔

"یہ ہمیں اُوپر سے نیچے اُترتے دیکھ کر خوش ہو گی۔" آفتاب نے کہا اور وہ سب ہنس پڑے۔

کامران مرزا اور مُنوّر علی خاں کے جانے کے بعد ان لوگوں نے پروگرام پر عمل شروع کیا۔ سب سے پہلے انھیں ایک مضبوط رسّی کی ضرورت تھی۔ یہ رسّی انھیں گودام میں سے مل گئی۔ اب وہ دبے پاؤں چھت پر چڑھے۔ اُنھوں نے اس کا ایک سرا برساتی کے ستون سے باندھا اور رسّی نیچے لٹکا دی۔ جُھک کر دیکھنے پر انھیں معلوم نہ ہو سکا کہ رسّی کا دُوسرا سرا زمین پر پہنچا یا نہیں، کیوں کہ اس طرف تاریکی تھی۔

"جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ رسّی کہاں تک پہنچی ہے، ہم نیچے اُترنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔" آصف نے کہا۔

"تو جو چیز تم مول لے سکتے ہو، بتا دو۔ میں خرید

دوں گا۔" آفتاب نے جلدی سے کہا۔

"ہو سکتا ہے، رسّی پندرہ بیس فٹ اُونچی رہ گئی ہو، اس صُورت میں ہم ضرور اپنی ٹانگیں تُڑوا بیٹھیں گے۔" آصف بولا۔

"اور چُوں کہ ہمیں ابھی صحیح سلامت ٹانگوں کی بہت ضرورت ہے، اس لیے یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے۔" آفتاب بولا۔

"تُم تو بس باتیں ہی بناتے رہا کرو۔ ارے بھائی، یہ کام کا وقت ہے۔ خطرہ ابھی تک ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ فرحت، تم ہی کوئی ترکیب بتاؤ۔ ہم یہ کیسے معلوم کریں کہ رسّی نیچے تک پہنچ گئی ہے۔"

"نیچے جا کر دیکھ لو۔" آفتاب نے جلدی سے کہا۔

"پھر بولے تُم۔ تُم سے پُوچھ کون رہا ہے۔" آصف نے غُصّے میں آتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے، نیچے سے ٹارچ لے آؤ۔" فرحت نے جلدی جلدی ترکیب بتائی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں آفتاب درمیان میں نہ بول پڑے۔

"میں جا کر ٹارچ لاتا ہوں۔" آصف نے کہا اور سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔

"واہ! کیا سُہانا سماں ہے۔ تاروں بھرا آسمان، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، کھلی چھت۔ چھت سے لٹکی ہوئی رسّی۔ فرحت ذرا نیچے جھک کر دیکھنا۔ آصف ٹارچ لے کر آ رہا ہے یا نہیں۔"

فرحت بے خیالی میں نیچے جھانکنے لگی۔ آصف اُسے واپس آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ بھی تھی، یہاں تک کہ وہ اُوپر آ گیا اور آتے ہی بولا:

"لو، ٹارچ بھی آ گئی۔ میں نیچے لائٹ ....."

وہ خاموش ہو گیا اور چھت پر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ فرحت نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ پھر حیران ہو کر بولی:

"کیا بات ہے، تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

"آفتاب کہاں گیا؟" آصف کے مُنہ سے نکلا۔

"ارے! ابھی تو یہیں تھا۔" فرحت نے گھبرا کر کہا۔

"وہ کوئی پرندہ تو ہے نہیں کہ اُڑ گیا ہو گا۔" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"میں سمجھ گئی۔ یہی بات ہو سکتی ہے۔"

"کیا بات؟ تم کیا سمجھ گئیں؟"

"ضرور کوئی جن یا پری چھت کے اُوپر سے اُڑ رہی ہو گی۔ اس کی نظر آفتاب پر پڑ گئی ہو گی اور وہ اُسے اُڑا لے گئی۔"

"ہشت۔ تم بھی آفتاب جیسی باتیں کرنے لگیں۔ کسی جن یا پری کی نظر تم پر کیوں نہیں پڑ گئی؟ تم بھی تو چھت پر ہی موجود تھیں۔"

"میں... میں تو نیچے جھکی تمھیں دیکھ رہی تھی۔"

اچانک آصف کو کوئی خیال آیا۔ منڈیر پر جھک کر اُس نے ٹارچ کی لائٹ نیچے ڈالی۔ فرحت بھی اس کے ساتھ ہی نیچے جھک گئی تھی۔

دُوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئے۔ آفتاب نیچے کھڑا اُوپر سر اُٹھائے، انھیں دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔

تیسرا پتھر

کامران مرزا اور مُنوّر علی خاں واپس پہنچے تو حالات اسی طرح تھے۔ سب انسپکٹر خالد انھیں نشانے پر لیے کھڑا تھا۔ کانسٹیبل بھی چوکس کھڑے تھے۔

"مُنوّر علی خاں، اب تم ذرا یشوما سے باتیں کر کے یہ جاننے کی کوشش کرو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کی ان لوگوں سے کیا دشمنی ہے۔"

"ایسے ٹھیک نہیں رہے گا۔ تم سوال بتاتے رہو، میں یشوما سے کر کے اس کے جواب تمھیں بتاتا رہوں گا۔"

"چلو، یوں ہی سہی۔ اس سے پوچھو کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔"

مُنوّر علی خاں نے سوالات اور جوابات کا سلسلہ شروع کیا:

"یشوما، تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"میں جو کچھ چاہتا ہوں، ان لوگوں کے سامنے نہیں

بتا سکتا۔" اس نے کہا۔

"تم ہو کون؟ یہ تو بتاؤ۔"

"میں یشوما ہوں۔" یشوما نے پہلی مرتبہ مسکرا کر کہا۔

"بہت خوب! کتنا صحیح جواب ہے۔ تمھارا تعلق کس ملک سے ہے؟"

"میں افریقہ کا باشندہ ہوں۔"

"وہ تو تم شکل سے ہی نظر آتے ہو۔" منوّر علی خاں نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر پوچھ کیوں رہے ہو؟" یشوما نے بُرا مان کر کہا۔

"اچھا بھائی، نہیں پوچھتا۔ یہ بتاؤ، ان لوگوں کی تم سے کیا دشمنی ہے؟"

"یہ میں تمھیں نہیں بتا سکتا۔" یشوما نے کہا۔

"تو پھر کس کو بتا سکتے ہو؟"

"اس ملک میں صرف دو آدمی ہیں جنھیں یہ بات بتا سکتا ہوں۔"

"اور وہ کون ہیں؟"

"میں یہ بھی ان کے سامنے نہیں بتا سکتا۔"

"معلوم ہو گیا۔ تم اسّی فی صد باتیں ان لوگوں کے سامنے نہیں بتا سکتے۔ خیر، ہم تم سے الگ ملاقات کا بندوبست بہت

جلد کریں گے۔"

"اب ہمیں کیا کرنا ہے؟" منوّر علی خاں کامران مرزا کی طرف مڑے۔

"یہ تینوں غیر قانونی طور پر میرے گھر میں داخل ہوئے ہیں اور انھوں نے ہمیں گیس پستول سے ختم کرنے کی دھمکیاں بھی دی ہیں۔ ایک دروازہ بھی توڑا ہے۔ اس لیے میں انھیں قانون کے حوالے کرنے کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔ رہا یشوما تو اس سے علیحدگی میں بات کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں کہ اسے قانون کے حوالے کیا جائے یا نہیں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" منوّر علی خاں بولے۔

"مسٹر خالد، تم ان لوگوں کے ہتھکڑیاں لگاؤ اور لے جا کر حوالات میں بند کر دو۔ اس کے بعد پھر یہاں آ جانا۔"

"جی، بہت بہتر۔" انسپکٹر خالد نے کہا اور ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں لیے نمبر نو کی طرف بڑھا۔

"خبردار! میرے قریب آنے کی جرأت نہ کرنا، ورنہ ختم ہو جاؤ گے۔" نمبر نو نے غرّا کر کہا۔

"بکو مت!" خالد نے تیز لہجے میں کہا۔

اچانک یشوما نے کچھ کہا۔ مُنوّر علی خاں پریشان ہو گئے اور جلدی سے بولے "مسٹر خالد، رک جائیے۔ نمبر نو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یشوما نے کہا ہے کہ ان کے قریب جانا موت کو آواز دینا ہے"۔ خالد ٹھٹک کر رک گیا۔

"مسٹر یشوما، پھر ہم ان پر کیسے قابو پا سکتے ہیں؟ وہ کون سا حربہ ہے جو استعمال کر کے یہ ہمیں موت کے حوالے کر سکتے ہیں؟" مُنوّر علی خان نے پُوچھا۔

"تم انھیں صرف جال پھینک کر گرفتار کر سکتے ہو یا پھر پہلے انھیں کسی طرح بے ہوش کر لو۔ تب یہ تمھارے قابو میں آ سکتے ہیں۔ ان کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھوں میں لوہے کا ایک چھلّا ہے۔ اس چھلّے میں ایک باریک سی نوک اُبھری ہوئی ہے۔ اس نوک کا نام سُرخ موت ہے۔ جس کے جسم سے یہ نوک چھُو جائے اس کی موت اس قدر خوفناک ہوتی ہے کہ اُسے مرتے ہوئے دیکھا بھی نہیں جا سکتا۔"

"اوہ! آخر یہ کیسے چھلّے ہیں؟" مُنوّر علی نے کامران مرزا کو ساری بات بتانے کے بعد پُوچھا۔

"اُن پر ایک عجیب و غریب زہر لگا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ تم خوش قسمت ہو۔ انھوں نے اب تک یہ ہتھیار تم پر استعمال نہیں کیا۔ شاید انھیں حکم

نہیں ہے۔"

کامران مرزا کا منھ فق ہو گیا۔ اُنھوں نے اپنے بچّوں کو سُرخ موت کی طرف اپنے ہاتھوں سے دھکیل دیا تھا۔ وہ پُوری قوّت سے چلّائے:

خالد! ان لوگوں کو نشانے پر رکھو۔ مُنوّر علی، تم بھی یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

اُنھوں نے یہ کہا اور تیزی سے دوڑتے ہوئے زینے پر چڑھنے لگے۔ ان کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

آصف کو بُری طرح غصّے نے آ لیا تھا۔ اتنی دیر تک آفتاب بے پر کی اُڑا رہا تھا۔ حال آں کہ وہ پہلے ہی جانتا تھا کہ رسّی کافی لمبی ہے۔ آصف کے خیال میں اس نے بے کار وقت ضائع کیا تھا۔ اسے غصّہ کیا آیا، اس نے بھی رسّی پکڑی اور پیروں کو دیوار کے ساتھ لگا کر تیزی سے نیچے اُترنے لگا۔ فرحت نے ٹارچ کی روشنی نیچے ڈال کر اس کی مدد کی۔ جلد ہی وہ بھی آفتاب کے ساتھ کھڑا تھا۔ پھر وہ دیوار سے لگ کر صدر دروازے کی طرف کھسکنے لگے۔

"اندھا دُھند آگے بڑھتے جا رہے ہو۔ کچھ سوچا بھی ہے کہ ان پر کیسے قابو پاؤ گے؟" آصف نے انھیں روکتے ہوئے کہا۔

"ابھی سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کے نزدیک پہنچ کر سوچوں گا۔"

"بے وقوف مت بنو۔" آصف چلتے چلتے رک گیا۔

"اگر تمھارے خیال میں میں بے وقوف بن رہا ہوں تو تم بتاؤ، عقل مند کیسے بن سکتا ہوں؟" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"ان میں سے ایک پائیں باغ والی کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو گا۔" آصف بولا۔

"کوئی ایسی بات بتاؤ جو میں نہ جانتا ہوں۔" آفتاب نے کہا۔

"اور دو صدر دروازے پر کھڑے ہوں گے۔" آصف نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔

"میرا خیال ہے۔ کہ میں یہ بات بھی جانتا ہوں۔"

"اگر وہ دو ہوتے تو ہم ایک کو سنبھال لیتے۔"

"تو اب کیا ہو گیا ہے؟"

"تیسرے کا کیا بنے گا؟ دو سے ہم الجھ بھی گئے تو تیسرا ان کی مدد کو پہنچ کر کام خراب کر دے گا۔"

"کن کا کام خراب کر دے گا؟ ان کا یا ہمارا؟" آفتاب مسکرایا۔

"تم ایسے میں بھی سنجیدہ نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے کہ

کام ہمارا ہی بگڑے گا۔ ان کا تو سنورے گا۔"

"نہیں سنورے گا۔" آفتاب نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ آخر تم نے سوچا کیا ہے؟"

"کبھی تم بھی کچھ سوچ لیا کرو۔ ہر کام میرے ہی سر پر نہ ڈال دیا کرو۔"

"میں تو سوچ چکا ہوں۔" آصف بولا۔

"جب سوچ چکے ہو تو مجھے کیوں بور کر رہے ہو؟ آگے بڑھو۔"

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے کیا سوچا ہے۔"

"پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ میں اور تم کرکٹ کے کھلاڑی ہیں اور باؤلنگ میں ماہر بھی ہیں ہم پتھر کے ٹکڑوں کو کرکٹ کی گیندیں فرض کر لیں گے اور دشمنوں کے سروں کو وکٹیں۔ اور جب یہ دو باتیں کرکٹ کا کوئی کھلاڑی فرض کر لے تو اس کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"بھئی واہ! تم تو واقعی بہت تیز ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ پتھر کہاں سے آئیں گے؟"

"پائیں باغ کی باڑھ کے ساتھ ساتھ نوکیلے پتھر بھی لگے ہوئے ہیں۔ ہم انھیں آسانی سے اکھاڑ لیں گے۔"

"تو یوں کہو، تم نے پہلے ہی سب کچھ سوچ رکھا تھا۔"

"اب تم سمجھے۔ آؤ، آگے چلیں۔"

"ہاں۔ اب مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کیا خیال ہے، پہلے ہم کس کو نشانہ بنائیں گے؟"

"پہلے صدر دروازے پر کھڑے دو حضرات کو نشانہ بنائیں گے اور وہیں ٹھہریں گے۔ ظاہر ہے کہ تیسرا یہ دیکھنے کے لیے آگے بڑھے گا کہ ان کو کیا ہوا۔ جوں ہی وہ جھک کر انھیں دیکھے گا، اس کے سر میں ایک پتھر لگے گا۔" آفتاب نے ترکیب بتائی۔

"بہت خوب! ترکیب تو بہت جان دار ہے، لیکن اگر ہمارا کوئی نشانہ خطا ہو گیا تو کیا ہو گا؟" آصف نے کہا۔

"جو خدا کو منظور ہے، وہ ہو گا۔ ہم اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اگر ان کے پاس گیس پستول نہ ہوتے تو تب ہم ہاکی سے کام لے سکتے تھے، لیکن اب تو دُور رہ کر ہی کام کرنا ہو گا۔"

"فرحت بے چاری چھت پر کھڑی سُوکھ رہی ہو گی۔"

"اسے سُوکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ نیچے اُتر کر کسی کمرے میں آرام کر سکتی ہے۔" آفتاب بولا۔

"بھلا ان حالات میں آرام کیا جا سکتا ہے؟"

"تو کن حالات میں آرام کیا جا سکتا ہے؟" آفتاب نے کہا۔

"یار، کان نہ کھاؤ۔"

"کھانے کی کوئی اور چیز جو نہیں ہے۔" آفتاب نے ہنس کر کہا۔

"اچھا، بس اب خاموش رہو۔ ہم صدر دروازے کے نزدیک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اگر ان کے کانوں میں ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو سارا پروگرام دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔" آصف نے جل بھن کر کہا۔

"تو کباب کیوں ہو رہے ہو۔ فی الحال میرا کباب کھانے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"توبہ ہے تم سے۔ تم کس چیز کے بنے ہو؟"

آصف جھلاہٹ میں چلتے چلتے رُک گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آفتاب پریشان ہو گیا اور جلدی سے بولا:

"کیا بات ہے؟ کیا سر میں درد ہو گیا ہے؟"

"تمھاری باتیں سر میں درد ہی کیا، پاگل کر دینے کے لیے بھی کافی ہیں۔"

"مجھے آج ہی معلوم ہوا کہ یہ اتنی کارگر ہیں۔"

"اچھا، میں یہیں سے لوٹ رہا ہوں۔ تم ہرگز اس مہم میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جو آدمی اتنا غیر سنجیدہ

ہو، وہ کیا کام کر سکتا ہے۔" آصف کو غصّہ آگیا۔

"بڑی خوشی سے واپس چلے جاؤ۔ میں اکیلا ہی ان تینوں سے نپٹ لوں گا۔" آفتاب مسکرایا۔

"ناک میں دم کر دیا ہے تم نے۔ خدا کے لیے اب چپ ہو جاؤ۔"

"بہت اچھا، اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں اب نہیں بولوں گا۔"

"شکر ہے خدا کا۔ تمھارے منھ سے یہ بات سن کر مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔" آصف نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ آفتاب نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے تھے۔ یہ دیکھ کر آصف مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

اچانک وہ چلتے چلتے رک گئے۔ وہ صدر دروازے کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے اور باڑھ کی اوٹ میں تھے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ دو آدمی صدر دروازے پر چوکس کھڑے تھے۔ اُن کے منھ دروازے کی طرف تھے۔ ان کی طرف اُن کی کمریں تھیں۔ آفتاب نے خاموشی سے تین پتھر زمین میں سے نکالے۔ ایک آصف کو تھما دیا اور دو خود پکڑے رہا۔ پھر اس نے اسے اشارہ کیا اور

دونوں پتھر مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انھوں نے ایک، دو، تین کہا اور نشانہ لے کر پوری قوت سے پھینک دیے۔

فضا میں دو خوف ناک چیخیں اُبھریں اور وہ دونوں دروازے کے سامنے لمبے لمبے لیٹ گئے۔

باغیں باغ میں موجود تیسرے شخص نے بوکھلا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اسے اپنے ساتھی زمین پر لیٹے نظر آئے۔ وہ گھبرا گیا۔ لیکن اندھا دھند ان کی طرف بڑھنے کی بجائے زمین پر لیٹ کر رینگنے لگا۔ تیزی سے رینگتا ہوا وہ باغ سے باہر نکل آیا۔ لیٹے لیٹے وہ ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ ان کے سروں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بالکل بے ہوش تھے اور ان کے پستول اندھیرے میں نہ جانے کہاں جا گرے تھے۔ اس نے پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ جب کچھ نظر نہ آیا تو ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔ عین اسی وقت اسے تیر کی طرح کوئی چیز اپنی طرف آتی محسوس ہوئی۔ وہ جلدی سے ایک طرف ہو گیا۔ وہ چیز اس کے شانے سے پوری قوت سے ٹکرائی۔ اس کے منھ سے ایک آہ نکل گئی۔ لیکن یہ چوٹ ایسی نہ تھی کہ وہ بے ہوش ہو جاتا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔

یہ ایک نوکیلا پتھر تھا۔ اس نے اس سمت میں دیکھا، جس طرف سے پتھر آیا تھا وہاں اُسے دو لڑکے کھڑے نظر آئے۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پستول کی نال کا رخ ان دونوں کی طرف کر کے ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگا۔ اس کی نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں، یہاں تک کہ وہ ان کے نزدیک پہنچ گیا۔

آصف اور آفتاب اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ اچانک پستول والا سانپ کی طرح پھنکارا:

"میں تمھیں اس پستول سے نہیں، سُرخ موت سے ماروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ پھر ان کی طرف قدم اُٹھانے لگا۔ سُرخ موت کا نام سُن کر آفتاب اور آصف کے رنگ اُڑ گئے۔ ان کی تدبیر ناکام ہو گئی تھی اور موت قدم بہ قدم اُن کی طرف بڑھ رہی تھی۔

انسپکٹر کامران مرزا چھت پر پہنچے تو وہاں صرف فرحت کو دیکھ کر ان کی سٹی گم ہو گئی، ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

"کیا وہ دونوں نیچے اُتر چکے ہیں؟" اُنھوں نے بوکھلائی

ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں انکل، ابھی ابھی گئے ہیں۔ کیوں، کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟"

"اوہ! یہ تو بہت بُرا ہوا۔ بہت بُرا ہوا۔ بہت بُرا۔" کامران مرزا بڑبڑائے اور تیزی سے واپس نیچے چلے گئے۔ فرحت انھیں حیرت زدہ انداز میں دیکھتی ہی رہ گئی۔ ابھی وہ نیچے جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کامران مرزا دوبارہ اُوپر چڑھتے نظر آئے۔ اس مرتبہ ان کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔ اُنھوں نے ریوالور جیب میں رکھا اور فرحت سے بولے:

"آفتاب اور آصف خطرے میں ہیں۔ میں اُن کی مدد کے لیے جا رہا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے رسّی پکڑی اور دیوار کے سہارے نیچے لٹک گئے۔ وہ بندروں کی سی پھرتی سے نیچے اُتر رہے تھے۔ فرحت انھیں منڈیر سے جُھک کر دیکھتی رہی۔

کامران مرزا ہر خطرے سے بے نیاز تیزی سے صدر دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر وہ رک گئے۔ انھوں نے ایک خوف ناک منظر دیکھا تھا۔ آفتاب اور آصف صدر دروازے کے سامنے چُپ چاپ کھڑے تھے اور ایک لمبا تڑنگا شخص پستول تانے اُن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جان گئے کہ یہ

ان تینوں میں سے ایک ہے اور اس کے ہاتھ میں ضرور گیس پستول ہے۔ اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جیب سے پستول نکالا اور اس کے پستول والے ہاتھ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔

دوسرے ہی لمحے پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں پرواز کرتا ہوا پائیں باغ میں جا گرا۔

"خبردار! ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو بھیجا اُڑا دوں گا" کامران مرزا نے گرج دار آواز میں کہا۔ اُن کی آواز سُن کر دونوں لڑکوں کی جان میں جان آئی۔

"اس کے نزدیک نہ جانا۔ یہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے" کامران مرزا نے دونوں لڑکوں کو خبردار کیا۔

"ابّا جان! آپ کیسے آ گئے؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ، اس کے دو ساتھی کہاں ہیں؟ ان کا کیا بنا؟"

"ہم انھیں زخمی کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، لیکن اس کی ہاری نشانہ چوک گیا۔ وہ دونوں دروازے کے پاس بے ہوش پڑے ہیں۔"

"بہت خوب! اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ناکام نہیں رہے۔ خیر، اب ہمیں ان کا انتظام کرنا ہے" کامران مرزا

نے کہا اور جُھک کر آفتاب کے کان میں کچھ کہنے لگے۔

آفتاب نے خوش ہو کر سر ہلایا اور باڑھ کے پاس چلا گیا۔ کامران مرزا پستول تانے کھڑے رہے۔ اچانک ایک نوکیلا پتھر ہوا میں تیرتا ہوا آیا اور سیدھا دُشمن کے سر سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح لمبا لمبا لیٹ گیا۔ پتھر آفتاب نے پھینکا تھا۔

بدلتے نقشے

"اب ہم انھیں گرفتار کر سکتے ہیں۔ آصف، تم اس جگہ جاؤ جہاں سے نیچے اُترے تھے۔ چھت پر فرحت موجود ہے۔ اس سے کہو، رسّی ستون سے کھول کر نیچے پھینک دے۔ رسّی لے کر فوراً یہاں آؤ تاکہ ہم ان تینوں کو باندھ سکیں۔ یہ بھی سُن لو، ان لوگوں کے انگوٹھوں سے بچ کر رہنا۔ ان میں سے ہر ایک کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں لوہے کا ایک چھلّا ہے۔ ان چھلّوں میں ایک نوک اُبھری ہوئی ہے۔ اس نوک کو یہ لوگ جس آدمی کے جسم سے چھُوا بھی دیں، وہ پلک جھپکتے میں مر جاتا ہے۔ وہ کس طرح مرتا ہے؟ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا۔ البتہ یہ لوگ اسے سُرخ موت کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ موت اس قدر خوف ناک ہے کہ کوئی شخص دُوسرے کو مرتے ہوئے دیکھ بھی نہیں سکتا۔"

"اوہ!" ان کے مُنھ سے نکلا۔

"ہاں۔ اب تم جاؤ، آصف۔ رسّی لے کر فوراً یہاں آؤ۔"

آصف نے رسّی لانے میں صرف دو منٹ لگائے۔

اس کے بعد کامران مرزا نے خود اپنے ہاتھوں سے ان تینوں کو مضبُوطی سے باندھا۔ ایسا کرتے وقت اُنھوں نے تینوں کے انگوٹھوں کو اپنی نظر میں رکھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تینوں میں سے کوئی جان بوجھ کر بے ہوش بنا پڑا ہو، اور موقع پا کر چھلّے کی نوک اُن کے جسم میں چبھو دے۔ تینوں کو باندھنے کے بعد اُنھوں نے انھیں پائیں باغ میں لا ڈالا۔

"اور اب ہم اندر بھی یہی کرتب دکھائیں گے۔ آفتاب، تم تین پتھر اُٹھا لو۔ ہم ایک ایک پتھر چلائیں گے اور ان تینوں کو بے ہوش کر کے باندھ لیں گے۔"

"اور یشوما کا کیا کریں گے؟"

"وہ اکیلے میں کچھ باتیں بتانا چاہتا ہے۔ پہلے ہم اس سے باتیں کرلیں۔ ویسے اس کے انگوٹھے میں چھلّا نہیں ہے۔ اس لیے اس سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ البتہ اس کے ہاتھ میں چاقو ہو تو وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔"

"اور چاقو اب اس کے پاس کوئی رہا نہیں۔"

"ہاں۔ ہم ان پر قبضہ کر چکے ہیں۔"

"تو پھر چلیے اندر۔"

"ہم اندر صدر دروازے کے ذریعے ہی جا سکتے ہیں۔ رسّی کے ذریعے اُترنا تو آسان ہے، چڑھنا بہت مشکل ہے۔ اور پھر اندر حالات ہمارے قابو میں ہیں۔ اس لیے ہم بے فکر ہو کر جا سکتے ہیں۔" کامران مرزا دروازے کی طرف چل پڑے۔ اُنھوں نے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ دُوسری طرف سے قدموں کی چاپ سُنائی دی، پتھر والے ہاتھ اُنھوں نے کمر کے پیچھے کر لیے تھے تاکہ ان لوگوں کی نظر اُن پر نہ پڑے اور اندر جانے کے بعد وہ موقع ملتے ہی پتھر اُن پر پھینک سکیں۔

چٹخنی گرنے کی آواز سُنائی دی اور پھر ایک دم دروازہ کُھل گیا۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ دروازہ کھولنے والا نمبر نو تھا اور اس کے ہاتھ میں انسپکٹر خالد کا پستول تھا۔

"ہاتھ اُوپر اُٹھا لو۔ پانسا ایک بار پھر پلٹ چکا ہے۔"

پتھر نیچے گر گئے اور ان کے ہاتھ اُوپر اُٹھ گئے۔ حیرت کی وجہ سے اُن کے مُنھ سے کوئی لفظ تک نہ نکل سکا۔ وہ تو اندر سب کچھ ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر آئے تھے۔ انسپکٹر خالد ان سب کو نشانے پر لیے کھڑا تھا۔ اس کے پاس تو مُنوّر علی خاں اور تین کانسٹیبل بھی تھے۔ پھر یہ کایا

پلٹ کیسے ہو گئی؟

"چلو اندر!" نمبر نو نے انھیں پستول کی نال سے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ اگر بچّے ساتھ نہ ہوتے تو کامران مرزا اس پر حملہ کر دیتے، لیکن اس ڈر سے کہ کہیں پستول نہ چل جائے اور گولی ان میں سے کسی کے نہ لگ جائے، وہ اس اِقدام سے باز رہے اور خون کے گھونٹ پیتے اندر داخل ہوگئے۔ آفتاب اور آصف ان کے پیچھے تھے۔ اندر وہ سب ہاتھ اُٹھائے کھڑے تھے۔ ہاتھ اُٹھانے والوں میں لیشوما بھی تھا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" کامران مرزا نے پُوچھا۔

"کیا بتاؤں، جناب۔ پستول چلنے کی آواز سُن کر ہم سب چونک اُٹھے تھے۔ اس موقع سے ان لوگوں نے فائدہ اُٹھالیا۔ نمبر نو نے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا، جسے نمبر دس نے اُٹھا لیا۔ اس کے بعد تو انھیں کسی پستول کی بھی ضرورت نہیں رہی، کیوں کہ یہ پستول تو خود ہی پستول سے زیادہ خطرناک ہیں۔ اُنھوں نے ہمیں دھمکی دی کہ اگر کسی نے کوئی حرکت کی یا ان کے نزدیک جانے کی کوشش کی تو سُرخ موت اس کا مقدر بن جائے گی۔ لیشوما نے بھی ہم لوگوں کو اس قسم کی حرکت سے باز رہنے کی ہدایت کی۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہم ہاتھ اُٹھائے کھڑے

ہیں۔" خالد نے شرم کے مارے سر جھکا لیا۔

"کوئی بات نہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ ہم نے سوچا تھا کہ ان لوگوں سے نپٹ کر یشوما سے بات چیت کریں گے لیکن شاید قدرت کو ابھی یہ منظور نہیں۔"

"اب کہ ہم ایک بار پھر تم لوگوں پر چھا چکے ہیں، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے میرے ان تین ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جو باہر موجود تھے۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ تم ان بچوں سمیت گھر سے باہر کیسے پہنچ گئے! کیا اس مکان کا کوئی دروازہ پچھلی طرف بھی کھلتا ہے؟" نمبر نو نے سوال کیا۔

"اس مکان کا دروازہ صرف ایک ہی ہے۔"

"تب پھر تم باہر کیسے نکلے؟" نمبر نو نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میرے یہ دونوں بچے کالا علم جانتے ہیں۔ بنگال کا جادو تو ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ اگر تم چاہو تو یہ اپنا جادو کا کمال تم لوگوں کو بھی دکھا سکتے ہیں۔" کامران مرزا یہ کہتے وقت مسکراتے رہے۔ دوسرے بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ آفتاب کی تو ہنسی نکل گئی۔

"تم لوگ عجیب ہو! اب بھی مسکرا رہے ہو، جب کہ

تم ہمارے قابو میں ہو۔" نمبر نو نے جھلا کر کہا۔

"کون کس کے قابو میں ہے، یہ تو وقت بتائے گا۔ دراصل ابھی تک ہمیں یہی معلوم نہیں ہو سکا کہ تم لوگ ہو کون اور چاہتے کیا ہو۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا تو اس وقت تم یہاں نہ ہوتے۔ کہیں اور ہوتے۔"

"تم آخر ہو کیا بلا؟" نمبر دس نے غصے میں آ کر کہا۔

"خبردار! مجھے بلا نہ کہنا۔ میں انسان ہوں۔"

"ساری انسانیت دھری رہ جائے گی۔"

"کب؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"ابا جان، اگر اجازت ہو تو ہم جادو کے زور سے غائب ہو جائیں؟" آفتاب بولا۔

"نہ بیٹا۔ ایسا نہ کرنا۔ یہ لوگ تمہیں کہاں تلاش کرتے پھریں گے۔ البتہ اگر یہ چاہیں تو تم ان لوگوں کو پتھروں والا کھیل دکھا سکتے ہو۔"

"کیا خیال ہے؟ تم جادو کے پتھروں کا کمال دیکھنا پسند کرو گے؟" آصف بولا۔

"یہ کیسا کھیل ہے؟" نمبر نو نے حیران ہو کر کہا۔

"کھیل ہے بس۔ کھیل تو کھیل ہی ہوتا ہے۔ وہ کیسا

ہوتا ہے، یہ دیکھنے کے بعد ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"

"بکو مت۔" نمبر گیارہ نے غرّا کر کہا۔

"جی اچھا۔" آفتاب نے کہا۔ پھر کامران مرزا کی طرف دیکھ کر بولا:

"ابّا جان، یہ لوگ جادوئی پتھروں کا کھیل دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"چلو، کوئی بات نہیں۔ یہ بدذوق ہیں۔ ایسے لوگوں کو کھیل دکھانا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ ویسے کیا تمھیں بین بجانا آتا ہے؟"

"جی ہاں۔ آتا تو ہے، لیکن صرف بھینسوں کے آگے۔" آفتاب نے معصومیت سے کہا۔

"بہت خوب! یہ لوگ تمھیں خوں خوار نظروں سے گھور رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، اب چپ ہو جاؤ۔ کہیں کاٹ نہ کھائیں۔"

"جی، بہت بہتر۔"

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ ہمارے تینوں ساتھی کہاں ہیں؟" نمبر نو نے پوچھا۔

"پائیں باغ میں آرام کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کے آرام میں خلل نہ ڈالو۔ وہ بڑے مزے میں ہیں۔"

"اوہ! تو تم نے انھیں ختم کر دیا۔ میں تم سب کو

زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مگر حیرت ہے کہ تم ان کو ختم کرنے میں کامیاب کیسے ہو گئے! وہ فائر کی آواز۔ مگر وہ تو ایک گولی چلنے کی آواز تھی، اور ایک گولی سے تین آدمی ختم نہیں کیے جا سکتے۔" نمبر نو کامران مرزا کو گھورنے لگا۔

باقی سب لوگ بالکل خاموش کھڑے تھے، جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ سب انسپکٹر خالد کا مارے شرمندگی کے اور کانسٹیبلوں کا مارے خوف کے برا حال تھا۔ البتہ منوّر علی ایسے انداز میں کھڑے تھے جیسے ان باتوں سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرے بچّے جادو جانتے ہیں۔ یہ اگر ہاتھوں میں پتھر اٹھا لیں تو وہ بھی جادو کے ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے تو بس اتنا کیا تھا کہ مکان سے باہر نکل کر تمھارے ساتھیوں کی طرف پتھر اچھال دیے۔ اس میں قصور نہ ان کا ہے، نہ پتھروں کا۔ یہ قصور تو تمھارے ساتھیوں کا ہے۔ وہ کیوں ان پتھروں کی زد میں آئے۔ باقی جو ایک پتھر کی زد میں آنے سے رہ گیا تھا، اس پر مجھے فائر کرنا پڑا۔"

"تو تم نے اسے ختم کر دیا؟" نمبر نو نے آگ بگولا ہو کر کہا۔

"بھلا میں کون ہوتا ہوں ختم کرنے والا۔ ختم کرنا یا زندگی دینا تو اس باری تعالیٰ کا کام ہے جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ لیکن تم یہ بات بھول گئے ہو کہ تمھیں بھی اسی نے پیدا کیا ہے۔ میں نے تو اس کے پستول والے ہاتھ کا نشانہ لے کر فائر کیا تھا۔ باقی کام تیسرے پتھر نے کیا ہے۔ بے فکر رہو۔ تمھارے تینوں ساتھی بڑے آرام سے سو رہے ہیں۔"

"ہوں۔ میں سمجھ گیا۔ نمبر دس اور گیارہ، تم اُن کو یہاں لے آؤ۔ ان کی قسمت کا فیصلہ ہم اُن کے یہاں آنے کے بعد کریں گے۔"

نمبر دس اور گیارہ چلے گئے۔ کمرے میں تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ آخر کامران مرزا یشوما کی طرف مڑے اور مُنوّر علی خان کی معرفت اس سے سوال کیا:

"مسٹر یشوما، اس سارے جھگڑے کی ابتدا تم سے ہوتی ہے۔ نہ تم اس گھر میں گھستے، نہ یہ لوگ آتے۔ خیر، میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔ خدا کے لیے اتنا بتا دو کہ یہ سب چکّر کیا ہے، تاکہ ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔"

"میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ میں تم لوگوں کا دشمن نہیں ہوں، البتّہ یہ لوگ تمھارے دشمن ہیں۔ ایسے دشمن کہ تم

سوچ بھی نہیں سکتے اور اگر تمھیں معلوم ہو جائے تو تمھارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔"

"خیر، فی الحال میں اپنے رونگٹے کھڑے کروانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اب تم اصل بات بتاؤ۔" کامران مرزا بولے۔

"اصل بات؟ کیا مطلب؟" یشوما نے حیران ہو کر کہا۔

"تم پہلے ان لوگوں کے ساتھی تھے؟"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن میں اپنی مرضی سے ان کا ساتھی نہیں بنا تھا۔ مجھے زبردستی بنایا گیا تھا۔ یشوما نے جواب دیا۔

"اور موقع پا کر تم بھاگ نکلے؟"

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"اور اب چوں کہ تم ان کے رازوں سے واقف ہو چکے ہو، اس لیے ان لوگوں نے تمھارا پیچھا کیا اور تم یہاں آ گھسے۔ یہ لوگ تمھیں جان سے مارنا چاہتے ہیں۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا۔"

"اچھا، ایک بات کا جواب ٹھیک ٹھیک دو گے؟" کامران مرزا نے اچانک کہا۔

"میں کوشش کروں گا۔"

"یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں؟"

یشوما کے مُنہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ نمبر نو کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے کہا "تمھاری زبان سے ایک لفظ نکلنے کی دیر ہے، گولی تمھارے جسم کے پار ہو گی۔"

پھر اس نے کامران مرزا سے کہا "ہمیں حکم ملا ہے کہ تمھیں زندہ گرفتار کیا جائے۔ ورنہ اس وقت تک تمھارا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔"

"کیا خیال ہے؟ اب بھی آپ سوال کرنا چاہتے ہیں؟" یشوما نے کامران مرزا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میری وجہ سے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو۔"

"شکریہ۔" یشوما کے مُنہ سے نکلا۔

"مُنوّر علی، چلو چل کر شطرنج کھیلیں۔ ان کو آپس میں لڑنے دو۔" کامران مرزا نے مُسکرا کر کہا۔

"ہرگز نہیں۔ تم ....."

اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ نمبر نو اور دس اپنے تینوں زخمی ساتھیوں کو سہارا دیے اندر لا رہے تھے۔

"اوہ! یہ تو کافی زخمی ہیں۔ انھیں آرام سے کرسی پر بٹھا دو۔" نمبر نو نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ پھر ان کی طرف مڑ کر بولا:

"میں اپنے ساتھیوں کا اِنتقام تم سے ضرور لوں گا۔"

"اور میں اپنے ٹوٹے ہوئے دروازے کا اِنتقام تم سے لینے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ مجھے دروازے پر کافی پیسے خرچ کرنے پڑیں گے۔"

اچانک مُنوّر علی بُری طرح چونکے۔ ان کو اس طرح چونکتے دیکھ کر وہ سب حیران رہ گئے۔ نمبر نو نے بھی یہ چیز نوٹ کی۔ اس نے مُنوّر علی خاں کو بغور دیکھا اور بولا:

"کیا بات ہے؟ تم کس بات پر چونکے ہو؟"

"میں؟ نہیں تو۔ دراصل کوئی چیونٹی میرے جسم کی سیر کر رہی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی مزے میں آ گئی اور اس نے میری گردن پر کاٹ کھایا۔ اسی لیے میں گڑبڑا گیا تھا۔"

"ہوں۔" نمبر نو نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔

دُوسری طرف کامران مرزا، آفتاب اور آصف سمجھ گئے تھے کہ مُنوّر علی خاں کیوں چونکے ہیں۔ انھیں فرحت کے خیال نے چونکایا تھا۔ فرحت، جس کو وہ چھت پر چھوڑ آئے تھے اور جو ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔

یشوما کی چال

فرحت بُری طرح گھبرا گئی تھی۔ یا تو کامران مرزا نے آفتاب اور آصف کو خود ان تینوں کے مقابلے پر بھیجا تھا، یا خود ان کو بچانے کے لیے جا رہے تھے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ آخر ہوا کیا ہے؟ نیچے جھک کر وہ کامران مرزا کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر وہاں سے صدر دروازے والی منڈیر کی طرف آئی۔

وہ دم بخود رہ گئی۔ آصف اور آفتاب اسے دو سایوں کی طرح دکھائی دیے۔ اُنھوں نے ہاتھوں میں کوئی چیز پکڑ رکھی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُنھوں نے وہ چیزیں صدر دروازے کی پھینکیں۔ دو بھیانک چیخیں فضا میں گونج گئیں۔ جلد ہی اس نے دیکھا، آفتاب نے پھر کوئی چیز پھینکی، مگر اس مرتبہ کسی کے مُنھ سے کوئی چیخ نہ نکلی۔ اس نے دیکھا، ایک شخص پستول اٹھائے ان دونوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ گھبرا گئی۔ ابھی تک کامران مرزا وہاں نہیں پہنچے تھے۔ وہ

چھت پر کوئی چیز تلاش کرنے لگی، جو اُٹھا کر پستول والے کے دے مارے۔ اچانک اس نے فائر کی آواز سُنی۔ پھر اس نے دیکھا کہ پستول والے کے ہاتھ سے پستول نکل کر پائیں باغ میں جا گرا ہے۔ پھر کوئی چیز اس کے سر پر لگی اور وہ زمین پر گر پڑا۔

اس کے بعد اس نے کامران مرزا، آفتاب اور آصف کو ان تینوں کو باندھتے دیکھا۔ پھر وہ صدر دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور سیڑھیاں اُترنے لگی۔ نیچے پہنچ کر نہ جانے اُسے کیا خیال آیا کہ وہ دبے پاؤں ڈرائنگ رُوم کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ دروازے سے باہر رہ کر دیکھنا چاہتی تھی کہ اب اندر کیا ہو رہا ہے۔

دروازے پر پہنچ کر اس نے تالے کے سوراخ پر ایک آنکھ جما دی۔ دُوسرے ہی لمحے وہ چونک اُٹھی۔ اندر کامران مرزا، آفتاب، آصف اور اس کے والد اور دُوسرے لوگ ہاتھ اُٹھائے کھڑے تھے۔

وہ حیران رہ گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اب اس گھر میں صرف وہ آزاد تھی، باقی سب دشمنوں کے سامنے ہاتھ اُٹھائے کھڑے تھے۔ وہ کچھ دیر تک سوچتی

رہی کہ کیا کرے! آخر دبے پاؤں دروازے سے ہٹ آئی اور کامران مرزا کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔

"اب ہم اس کھیل کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ نمبر دس اور گیارہ، تم یشوما کو باندھ لو۔ ہم اسے زندہ یہاں سے لے جائیں گے۔ یشوما کو باندھنے کے بعد ان سب کو ختم کرنا بھی ضروری ہو گیا ہے۔" نمبر نو نے کہا۔

نمبر دس اور گیارہ یشوما کی طرف بڑھے۔ یشوما خوف زدہ ہو کر پیچھے قدم اٹھانے لگا، یہاں تک کہ دیوار کے ساتھ جا لگا۔ خوف کے عالم میں اس کے منہ سے نکلا:

"نہیں..... نہیں..... مجھے گولی مار دو۔ زندہ گرفتار کر کے نہ لے جاؤ۔ میں..... میں اس کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا۔ خدا کے لیے مجھے یہیں مار دو۔"

اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ آنکھیں خوف کی وجہ سے باہر کو ابل آئی تھیں۔ انھوں نے آج تک کسی کو اس قدر خوف زدہ نہیں دیکھا تھا۔ ان کا جی چاہا کہ وہ یشوما کو گرفتار ہونے سے بچا لیں۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ اس وقت پستول نمبر نو کے ہاتھ میں تھا اور یوں بھی ان

میں سے ہر ایک پستول کی گولی سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔

نمبر دس اور گیارہ نے یشوما کے نزدیک پہنچ کر اپنے گلوں سے ٹائیاں اتاریں اور ایک ٹائی سے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھنے لگے۔ ہاتھ باندھنے کے بعد انھوں نے اسے زمین پر گرا دیا اور اس کی ٹانگیں باندھنے لگے۔ یشوما چلا رہا تھا:

"نہیں..... نہیں..... نہیں..... مجھے وہاں نہ لے جاؤ۔ مجھے اسی جگہ ختم کر دو۔ خدا کے لیے میری حالت پر رحم کرو۔"

انھوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ اسے مضبوطی سے باندھنے کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے اور اس طرح ہاتھ جھاڑنے لگے جیسے مٹی میں سن گئے ہوں۔

"ہمارا کام یہاں ختم ہوا۔ اب ہمیں گولی کے بجائے انھیں اجازت نہ ہوتے ہوئے بھی سرخ موت سے مارنا ہے۔ گولیوں کی آواز سے ارد گرد کے لوگ چوکنے ہو جائیں گے۔ پہلے ہی ایک فائر ہو چکا ہے۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ آج کی رات جو بھی ہمارے سامنے آئے گا، ہم اسے تہس نہس کر دیں گے۔" نمبر نو نے رکے بغیر کہا۔ پھر خوف ناک لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا:

"نمبر دس اور گیارہ، اب اپنا کام دکھاؤ۔ یہ لوگ بہت کالے علم، بنگال کے جادو اور چین کے جادو کی باتیں کرتے رہے ہیں۔ اب تم انھیں سرخ پہاڑیوں کا جادو دکھاؤ تاکہ اس شہر کا بچہ بچہ ان کا انجام دیکھ کر سرخ پہاڑیوں کے جادو سے پناہ مانگے۔ آگے بڑھو اور اپنے انگوٹھوں کو ان کے جسموں میں چبھو دو۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

نمبر نو اور دس ایک ایک قدم اٹھا کر سب سے پہلے کامران مرزا اور منوّر علی خان کی طرف بڑھنے لگے۔ کامران مرزا بولے:

"بہت اچھا کیا کہ تم پہلے ہماری طرف آ رہے ہو۔ موت کا ایک دن معیّن ہے۔ مسٹر خالد، تم اپنے ساتھیوں اور بچوں کو لے کر ایک طرف کھڑے ہو جاؤ اور ہماری موت کا منظر دیکھو۔"

سب انسپکٹر خالد اور کانسٹیبلوں کی حالت بہت خراب تھی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا معاملہ تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ پھر بھی خالد نے کامران مرزا کے الفاظ سن لیے اور ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ سب کمرے کے ایک کونے میں جمع ہو گئے۔ آفتاب اور آصف اپنی زندگی میں اس سے زیادہ کبھی پریشان نہیں ہوئے تھے۔ وہ سوچ

رہے تھے کہ کیا کریں! کیسے اپنے ابّا جان اور چچا جان کو بچائیں!

موت لمحہ بہ لمحہ ان سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ اس پر بھی ان دونوں کے سکون میں ذرّہ بھر بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ برابر مسکرائے جا رہے تھے۔ نمبر نو، دس اور گیارہ نے ان کو مسکراتے دیکھ کر حیرت زدہ انداز میں پلکیں جھپکائیں اور ٹھٹک کر انھیں دیکھنے لگے۔

اچانک کوئی چیز نمبر دس کے سر پر آ کر لگی۔ ساتھ ہی نمبر گیارہ کے سر سے بھی ٹکرائی۔ دونوں ایک لمحے کے لیے چکرا گئے۔ نمبر نو نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں فرحت کولھوں پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

ایک بہترین موقع کامران مرزا اور منوّر علی خان کے ہاتھ آیا تھا۔ نمبر دس اور گیارہ کے سر سے ٹکرانے والی چیزیں کرکٹ کی گیندیں تھیں۔ اگرچہ گیندوں نے دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا پھر بھی وہ اپنی جگہ سے اکھڑ گئے تھے۔ کامران مرزا اور منوّر علی کے لیے یہی کافی تھا دونوں اُن کے انگوٹھوں کو نظر میں رکھ کر اُن پر ٹوٹ پڑے

کامران مرزا کا زوردار مکّا نمبر گیارہ کے جبڑے پر اس زور سے پڑا کہ وہ جبڑا دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گیا۔

دونوں نے ان کو موقع دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس موقع پر نمبر نو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اگر وہ فائر کرتا تو گولی اس کے ساتھیوں کے بھی لگ سکتی تھی۔ اب کامران مرزا نے ایک ٹھوکر نمبر دس کے پیٹ میں رسید کی اور منوّر علی خان نے ایک اور مُکّا نمبر گیارہ کی کن پٹی پر مارا۔

دُوسرے ہی لمحے دونوں حیران رہ گئے۔ کیوں کہ اِس قدر زبردست چوٹیں کھانے کے بعد بھی وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اب کامران مرزا اور منوّر علی محتاط ہو گئے اور اُن کے آگے بڑھنے کا اِنتظار کرنے لگے۔ وہ چوٹ کھائے ہوئے اور جھلائے ہوئے تھے اِس لیے عقل اِستعمال کرنے کے بجائے اندھا دُھند اُن پر حملہ آور ہوئے اور انگوٹھوں کے چھلّوں کی نوکیں ان کے جسم میں چبھونے کے لیے ہاتھ ان کے چہروں کی طرف لائے۔

کامران مرزا نے ایک جُھکائی دی اور نمبر دس کے پیٹ میں ایک زبردست گھونسا مارتے ہوئے دُوسری طرف نکل گئے اِتنی دیر میں منوّر علی خان نے نیچے جُھک کر نمبر گیارہ کا وار روکا۔ اس کا انگوٹھا اُن کے سر کے اُوپر سے گزر گیا۔ منوّر علی خاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سر کی ایک زبردست ٹکّر اس کی ٹھوڑی پر دے ماری۔ نمبر گیارہ کے منہ سے ایک بھیانک

چیخ نکلی اور وہ فرش پر لیٹ گیا۔

کامران مرزا یہ دیکھ کر جوش میں آ گئے اور ہوا میں اُچھل کر دونوں پیروں سے نمبر دس کی کمر پر ایک زوردار ٹکّر ماری۔ وہ بِل بِلا اُٹھا اور فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ ان کی طرف سے بے فکر ہونے کے لیے دونوں نے ان کے سروں کو نشانہ بنا لیا اور اس وقت تک ٹھوکریں رسید کرتے رہے جب تک کہ وہ بے ہوش نہ ہو گئے۔

یہ ساری کارروائی نمبر نو نے بڑے سکون سے دیکھی تھی۔ جوں ہی اس کے ساتھی گرے، اس کا پستول والا ہاتھ تن گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے ساتھی جو اس کے نزدیک موت کے ہرکارے تھے، جن کے انگوٹھوں میں سُرخ موت قید تھی، وہ اس طرح لمبے لمبے لیٹ جائیں گے۔ تین ساتھی پہلے ہی زخمی ہونے کی وجہ سے بے کار ہو چکے تھے اور اب وہ تنہا رہ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر لیشوما خوشی سے چلّا اُٹھا اور آزاد ہونے کے لیے زور لگانے لگا۔ وہ ٹائیوں سے بندھا پڑا تھا۔

"مجھے کھول دو۔ خُدا کے لیے مجھے کھول دو۔ اس سے میں مُقابلہ کروں گا۔" وہ چلّانے لگا۔ منوّر علی خاں اس کے الفاظ کا ترجمہ اُنھیں سُنا رہے تھے۔

"صبر کرو، یشوما۔ ابھی تمھارا ایک دشمن آزاد ہے، اور اس کے ہاتھ میں پستول بھی ہے۔"

"اور اس پستول کی پہلی گولی یشوما کے پیٹ میں اُترے گی۔ آخر وقت تک میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اسے زندہ گرفتار کر کے یہاں سے لے جاؤں، لیکن شاید آج میرا اور میرے ساتھیوں کا ستارہ گردش میں ہے۔ اس وقت تک میرے پانچ ساتھی بےکار ہو چکے ہیں، لیکن اب میں ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں دوں گا۔ یشوما، تم خوش قسمت ہو جو آسان موت مر رہے ہو۔ تم اس کے پاس جانے سے بچ گئے ہو۔ جس کے پاس جانے کے خیال ہی سے تمھارے ہوش اُڑے جا رہے ہیں۔ خیر، اب تم تو جاؤ۔ تمھارے بعد ان سب سے بھی نپٹوں گا۔"

یہ کہہ کر نمبر نو نے نال کا رُخ یشوما کی طرف پھیر دیا۔ اس کی اُنگلی پستول کی لبلبی پر دباؤ ڈالتی چلی گئی۔ کامران مرزا کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس وقت نمبر نو کی پُوری توجّہ یشوما کی طرف تھی۔ اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک لمبی چھلانگ لگائی اور نمبر نو پر جا گرے۔ اس کے ساتھ ہی پستول چل گیا۔ لیکن نشانہ بہک چکا تھا۔ گولی نمبر نو کے ایک زخمی ساتھی کے شانے میں لگی۔ اس کے مُنھ سے ایک دردناک

چیخ بلند ہوئی۔

دُوسری طرف کامران مرزا ابھی تک نمبر نو سے گتھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اُس کا پستول والا ہاتھ مضبُوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ مُنوّر علی خان چونک کر بولے:

"کامران مرزا! کیا میری مدد کی ضرورت ہے؟"

"نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے پُوری قُوّت سے ایک مُکّا نمبر نو کے پستول والے ہاتھ پر مارا۔ اس کے مُنھ سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ پستول پر گرفت سُست پڑ گئی اور دُوسرے ہی لمحے پستول کامران مرزا کے ہاتھ میں تھا۔

اس دوران میں وہ نمبر نو کے اُوپر اس طرح چھائے رہے تھے کہ اسے اپنا انگوٹھا استعمال کرنے کی مہلت نہ مل سکی تھی۔ لیکن جُوں ہی کامران مرزا اُسے چھوڑ کر اُٹھے، اس نے تیزی سے انگوٹھے کا وار اُن کے مُنھ پر کیا۔

آفتاب، آصف اور فرحت کے مُنھ سے چیخیں نکل گئیں۔ کامران مرزا کی قسمت اچھی تھی کہ وہ پھرتی سے نیچے جُھک گئے اور نمبر نو کا وار خالی گیا۔ ساتھ ہی اُنھوں نے پستول کی نال کا رُخ نمبر نو کی طرف کر دیا۔ پھر خالد سے بولے

"اب ان سب کو باندھ لو۔ ان کے انگوٹھے خطرناک ہیں۔ اس لیے ان کے ہاتھ مضبوطی سے پُشت پر باندھنا۔"

سب انسپکٹر خالد کے مُنھ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ وہ ابھی تک شرمندہ تھا۔ یہ سب دھما چوکڑی اس کی غفلت کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور چاروں اُن کو باندھنے میں جُٹ گئے۔

دس منٹ بعد صورتِ حال پوری طرح ان کے کنٹرول میں تھی۔ سب لوگ بندھ چکے تھے۔ کامران مرزا نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول تپائی پر رکھ دیا اور خالد کی طرف مُڑے:

"ذرا تھانے جاؤ اور کچھ اور سپاہی لے آؤ تاکہ ان لوگوں کو حوالات میں پہنچایا جا سکے۔"

خالد کانسٹیبلوں کو لے کر باہر نکل گیا۔

"مسٹر یشوما، میں نے اپنے ان ساتھیوں کو اس لیے باہر بھیج دیا ہے تاکہ تم آزاد فضا میں بات کر سکو۔ اب تم کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" کامران مرزا نے مُنوّر علی کے ذریعے اس سے پوچھا۔

"میں اس حالت میں کس طرح بات کر سکتا ہوں۔ کم از کم مجھے کرسی پر تو بٹھا دو۔" یشوما نے کراہتے ہوئے کہا۔

کامران مرزا کو اس پر ترس آ گیا۔ انھوں نے اسے اُٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر آپ بھی اطمینان سے بیٹھ گئے کیوں کہ اب خطرے والی کوئی بات نہ تھی۔

"ہاں، یشوما، میں سب کچھ ٹھیک ٹھیک جاننا چاہتا ہوں۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں، لیکن کیا یہ کام دوستانہ فضا میں نہیں ہو سکتا؟"

"کیا مطلب" کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"مطلب یہ کہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور پیر بھی۔ کیا آپ لوگوں کو مجھ سے کوئی خطرہ ہے؟"

"اوہ! ضرور ضرور۔ ہم تمھارے ہاتھ کھولے دیتے ہیں۔ ہمیں تم پر اعتماد ہے۔ تم اچھے آدمی ہو۔ میں تو خود چاہتا ہوں کہ گفت گو دوستانہ ماحول میں ہو۔"

کامران مرزا نے یہ کہہ کر اس کے ہاتھوں اور پیروں پر بندھی ٹائیوں کو کھول دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پیروں کو اِدھر اُدھر حرکت دی۔ سکون کا ایک لمبا سانس لیا اور پھر بولا:

"ہاں، اب پوچھیے، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"پہلی بات تو یہ کہ تم کون ہو؟" مُنوّر علی خاں کے ذریعے کامران مرزا نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

"میں افریقہ کے ایک ملک یوگنڈا کا باشندہ ہوں۔ اپنے ملک میں چاقو بازی کے مقابلوں میں حصّہ لیا کرتا تھا اور اس کام میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ میری شہرت دُور دُور تک

پھیل گئی تھی۔"

"لیکن تم ان لوگوں کے ساتھی کیسے بن گئے؟"

"مجھے بُلایا گیا تھا اور ایک لاکھ روپے کا چیک بھیجا گیا تھا۔ خط میں لکھا گیا تھا کہ اگر میں یہ پیش کش قبول کروں تو ہر مہینے دس ہزار روپے تنخواہ دی جائے گی۔ میں اس جال میں آ گیا اور اپنے وطن سے نکل کھڑا ہوا۔"

"اُنھوں نے پتا کہاں کا لکھا تھا؟" کامران مرزا نے پُوچھا۔

"اُنھوں نے لکھا تھا کہ وہ لندن کے ہوائی اڈّے پر ملیں گے اور مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جائیں گے۔ ایسا ہی ہوا۔ وہ لوگ مجھے ہوائی اڈّے پر ملے اور اپنے ساتھ لے کر ایک ہوائی جہاز کے ذریعے کسی مُلک کے ہوائی اڈّے پر اُترے۔ وہاں اُن کی کار تیار کھڑی تھی۔ میں کبھی اپنے مُلک سے باہر نہیں گیا تھا اور نہ میں کوئی دُوسری زبان ہی جانتا ہوں، اس لیے مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہ کون سے اڈّے پر اُترے تھے، اور وہاں سے کار کے ذریعے مجھے کہاں لے گئے۔ اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ کار مسلسل تین دن سفر کرتی رہی تھی۔ پھر ایک جگہ ہمیں گھوڑوں پر سوار ہونا پڑا، کیوں کہ پہاڑی علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ یہ سلسلہ اتنا لمبا تھا کہ ....."

یشوما کے الفاظ درمیان ہی میں رہ گئے۔ دروازہ اسی وقت کھلا تھا اور سب انسپکٹر خالد اپنے ساتھ چھ کانسٹیبلوں کو لے کر اندر داخل ہوا تھا۔ اُنھوں نے قیدیوں کو اُٹھا اُٹھا کر لے جانا شروع کیا۔ تین منٹ میں کمرا ان سے صاف ہو چکا تھا اس دوران میں ان کی توجّہ یشوما سے ہٹ گئی تھی۔ انسپکٹر خالد کے جانے کے بعد وہ پھر یشوما کی طرف مُڑے، لیکن دوسرے ہی لمحے بوکھلا اُٹھے۔ اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جو منظر اُنھوں نے دیکھا، اس کی توقّع کسی کو نہ تھی۔

یشوما نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر تپائی پر رکھا ہوا پستول اُٹھا لیا تھا اور اب کرسی پر اطمینان سے پستول اُن کی طرف تانے بیٹھا تھا۔

سیکرٹری صاحب

ان کی اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔
یشوما کے ہونٹوں پر طنزیہ مُسکراہٹ تھی۔ اس نے کامران مرزا کی طرف مُسکرا کر دیکھا اور بولا:
"وقت وقت کی بات ہے۔ اب میں جو چاہوں گا تم لوگوں کو بتاؤں گا۔ اور جو نہ بتانا چاہوں گا، نہیں بتاؤں گا۔"
"بالکل۔ ہم نے تو تمھارے ساتھ پہلے بھی زبردستی نہیں کی۔ تمھاری مرضی ہے جو کچھ بتانا چاہتے ہو، وہی بتاؤ۔ ہم سُننے کے لیے تیار ہیں۔"
"پہلے میں چند سوال کروں گا۔"
"ضرور کرو، بھائی۔" کامران مرزا نے خوش دِلی سے کہا۔
"تم لوگ کون ہو اور کیا کام کرتے ہو؟"
"میں ایک زمیندار ہوں اور میرے دوست کامران مرزا سرکاری افسر ہیں۔" مُنوّر علی خاں نے تعارُف کرایا۔
"اور یہ تمھارے بچّے ہیں؟" یشوما نے پُوچھا۔

"ہاں۔"
"تم اپنے وطن سے محبّت کرتے ہو یا تمھیں صرف اپنے گھر بار سے محبّت ہے؟"
"کیوں؟ تم نے یہ کیوں پُوچھا؟" کامران مرزا نے پُوچھا۔
"اگر تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ میں سب کچھ صاف صاف بتا دُوں تو تمھیں ایک کام کرنا ہوگا۔" یشوما نے پُراسرار لہجے میں کہا۔
"کام بتاؤ۔ ہم ہر کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔"
"مُلک کے وزیرِ خارجہ کے سیکرٹری کو یہاں بُلا لاؤ۔" یشوما نے کہا۔
"کیا مطلب؟" کامران مرزا زور سے اُچھلے۔
"ہاں۔ میرا خیال ہے، وہ اِسی شہر میں رہتا ہوگا۔"
"لیکن تم ان کو کیوں بُلانا چاہتے ہو؟" کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔ ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔
"میں جو کچھ بتانا چاہتا ہوں، اس کی موجُودگی میں بتاؤں گا۔ مجھے یہی ہدایت ملی ہے۔"
"تمھیں یہ ہدایت کِس سے ملی ہے؟"
"میں یہ نہیں بتا سکتا۔"

"لیکن اُنھیں اس وقت بُلا کر لانا تو بہت مُشکل ہو گا۔"

"اگر تمھیں اپنا وطن عزیز ہے تو یہ کام فوراً کرنا ہو گا۔ نہیں کرنا چاہتے تو میں چلا جاتا ہوں۔ کسی ایسے آدمی کو تلاش کروں گا جو اس کام کو کر سکے۔"

"تو پھر ایسا کرتے ہیں، میں اُنھیں کل صبح لے آؤں گا۔ تم رات کو یہیں آرام کرو۔ ہم بھی آرام کرتے ہیں۔" کامران مرزا نے تجویز پیش کی۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ تمھیں اِسی وقت جانا ہو گا۔ کیا تم انھیں جانتے ہو؟"

"ہاں۔ میں اُنھیں جانتا ہوں۔"

"اور وہ بھی تمھیں جانتے ہیں؟"

"میرا خیال تو یہی ہے کہ جانتے ہوں گے۔"

"تو بس پھر، اِسی وقت روانہ ہو جاؤ۔ یہ تمھارے ہی مُلک کا سوال نہیں اور بھی بہت سے مُلکوں کا سوال ہے۔"

"میں جاؤں گا۔ یقین مانو، میں اِسی وقت جاؤں گا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم پستول میرے حوالے کر دو اور اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر آرام کرو۔ ان لوگوں کو بھی اپنے اپنے کمروں میں جانے دو۔ یقین کرو۔ ہم سب محبِّ وطن ہیں۔ اپنے وطن کے لیے

جان تک دے سکتے ہیں۔" کامران مرزا کی آواز بھرّا گئی۔

"تمھارے لہجے سے صداقت جھلک رہی ہے، اس لیے میں تمھاری بات مانے لیتا ہوں۔ یہ اپنا پستول لے لو، اور یہ جان لو کہ میں تمھارے وطن کی حفاظت کے لیے اُمید کی آخری کرن ہوں۔ اگر کچھ بنائے بغیر ختم ہو گیا تو تم خواہ کتنے بھی وطن دوست ہو، اس مُلک کو نہیں بچا سکو گے۔ تم اور تمھارے بچّے بھی ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ میں تفصیل سے سیکرٹری صاحب کے سامنے ہی بتاؤں گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

یہ کہہ کر یشوما نے پستول انھیں دے دیا۔ اُنھوں نے فضلو کو یشوما کے لیے الگ کمرے میں بستر بچھانے کی ہدایت کی اور جب وہ سب سونے کے لیے چلے گئے تو کامران مرزا یشوما کے کمرے میں داخل ہوئے۔

"یشوما، میں تم پر اِعتماد کر کے سیکرٹری صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔"

یشوما ان کے الفاظ تو نہ سمجھ سکا لیکن مطلب ضرور سمجھ گیا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر اُنھیں رُخصت ہونے کا اِشارہ کیا اور وہ باہر نکل آئے۔

رات کے گیارہ بجے وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری کے گھر جانا اور وہ بھی کڑاکے کی سردی میں، ایک بہت تکلیف دہ کام تھا، لیکن کامران مرزا وطن کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھے۔ ابھی تک انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ملک کو خطرہ کیا ہے! نہ صرف ان کے ملک کو بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں کو بھی۔ وہ سیدھے آئی۔جی صاحب کے بنگلے پر گئے کیوں کہ پہلے اپنے افسرِ اعلیٰ کو اطلاع دینا ضروری تھا۔ آئی۔جی صاحب وزیرِ داخلہ سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ مجبوراً کامران مرزا نے خود ہی سیکرٹری صاحب کو فون کیا اور اُن سے ملاقات کا وقت مانگا۔

سیکرٹری صاحب کے بنگلے کے دروازے پر سنگین لگی رائفل کندھے پر رکھے، ایک پہرے دار تنا کھڑا تھا۔ ان کی موٹر سائیکل بنگلے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ چونک اُٹھا اور ایک دم اس نے رائفل ان کی طرف تان دی۔ کامران مرزا مسکرائے۔ وہ اس خیال پر مسکرائے تھے کہ آج کی رات بھی عجیب رات ہے۔ ان پر کبھی پستول تنتے ہیں، کبھی گیس پستول، کبھی سُرخ موت۔ اور اب رائفل تنی ہوئی تھی۔ قریب پہنچ کر اُنھوں نے موٹر سائیکل روک لی اور نیچے اُتر کر پہرے دار

کی طرف بڑھے۔ وہ کڑک کر بولا:

"خبردار! اس سے آگے ایک قدم نہ بڑھانا۔"

کامران مرزا مسکرا کر بولے "مجھے سیکرٹری صاحب سے ملنا ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں تم کون ہو؟"

"انسپکٹر کامران مرزا۔" اُنھوں نے سنجیدگی سے کہا "سیکرٹری صاحب کو اطلاع دو کہ کامران مرزا آیا ہے۔"

سپاہی نے رائفل کی نال نیچے کر لی اور جب کامران مرزا نے اسے اپنا شناختی کارڈ دکھایا تو انھیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔

کامران مرزا ڈرائنگ روم میں جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ سیکرٹری صاحب اس سے پہلے کئی دفعہ کامران مرزا سے مل چکے تھے اور اُن کے بہت گرویدہ تھے۔ جلد ہی اُنھوں نے قدموں کی چاپ سُنی۔ سیکرٹری صاحب اندر داخل ہو رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کامران مرزا اُنھیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

"میں جانتا ہوں کہ کوئی بہت ہی اہم معاملہ ہوگا۔ خیر، تم کم از کم الفاظ میں بتاؤ کہ کیا بات ہے؟"

"میں کوشش کروں گا کہ مختصر الفاظ میں پوری بات بتا

سکوں۔ آپ ذرا توجّہ سے سُنیے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے اس وقت تک جو واقعات پیش آئے تھے، بیان کرنے شروع کر دیے۔ سیکرٹری صاحب کی حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"اور اب اس کا کہنا ہے کہ وہ جو کچھ بھی بتائے گا، آپ کی موجودگی میں بتائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ جب معاملہ اس قدر اہم اور خطرناک ہے تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ چند منٹ ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔"

سیکرٹری صاحب ڈرائنگ رُوم سے نکل گئے اور تقریباً دس منٹ بعد واپس آئے۔ دونوں باہر نکلے۔ سیکرٹری صاحب کار میں بیٹھ گئے۔ کامران مرزا نے اپنی موٹر سائیکل سنبھال لی۔

گھر پہنچ کر اُنھوں نے سیکرٹری صاحب کو ڈرائنگ رُوم میں بٹھایا اور خود یشوما کو لینے چلے گئے۔ یشوما ابھی تک جاگ رہا تھا۔ البتہ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ کامران مرزا نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا:

"یشوما، وہ آ گئے ہیں۔" پھر خیال آیا کہ یشوما کی سمجھ میں ان کی بات کہاں آئی ہو گی۔ لیکن فوراً ہی دروازہ

کھلا اور یشوما نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا۔ کامران مرزا نے ہاں میں سر ہلایا اور اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آئے۔ یشوما نے سیکرٹری صاحب سے ہاتھ ملایا اور اُن کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں ذرا اپنے دوست مُنوّر علی خان کو بُلا لاؤں۔" کامران مرزا بولے۔

"کیوں؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہم یشوما کی زبان نہیں جانتے اور نہ یشوما ہماری۔ میرا دوست ترجمان کے فرائض انجام دے گا۔"

"وہ یشوما کی زبان کیسے جانتے ہیں؟"

"وہ افریقہ کے جنگلوں میں کافی وقت گزار چکا ہے اور وہاں کے قبائلیوں کا قیدی بھی رہا ہے۔"

"اوہ! پھر تو مجبوری ہے، ورنہ ایک غیر سرکاری آدمی کو اس قسم کے معاملات میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ وہ بہت بڑا محبِ وطن ہے۔"

"خیر، تم اسے بُلا لاؤ۔"

کامران مرزا مُنوّر علی خاں کو جگا کر لے آئے۔ اُنھوں نے بھی سیکرٹری صاحب سے مُصافحہ کیا اور ایک صوفے میں دھنس گئے۔

"میرا خیال ہے یشوما، اب تو تمھیں ساری بات بتانے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" کامران مرزا نے کہا۔

"میں آپ لوگوں پر بھروسا کیے لیتا ہوں۔ لیکن دراصل میں نے آپ کو صرف اس لیے نہیں بُلایا ہے کہ میرا بیان آپ کے سامنے ہوگا۔ اس کی ایک اور بھی وجہ ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔ سیکرٹری صاحب اور مُنوّر علی خاں بھی چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔

"ہاں، دراصل آپ کو....." یشوما کہتے کہتے رُک گیا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

وہ سب چونک اُٹھے۔ یشوما نے جو کچھ کہا تھا، مُنوّر علی اس کا ترجمہ کرتے کرتے رُک گئے۔ اُنھوں نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ یہ رات اپنے ساتھ کچھ اس قدر اچانک ہنگامے لے کر آئی تھی، اور واقعات ایک کے بعد ایک اس قدر تیزی سے پیش آئے تھے کہ وہ اب معمولی سی آواز سُن کر بھی گھبرا جاتے تھے۔ آخر کامران مرزا نے گرج دار آواز میں کہا:

"خبردار! دروازے پر جو کوئی بھی ہے، اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے۔"

اُن کے نام

"ابّا جان! یہ ہم ہیں۔" آفتاب کی آواز سُنائی دی۔

وہ سب مُسکرا دیے۔ آخر کامران مرزا نے کہا "تم لوگ اندر آ جاؤ۔"

"فوراً ہی آفتاب، آصف اور فرحت اندر داخل ہوئے۔ وہ چھپے ہوئے تھے۔ آنکھیں نیچے جُھکی تھیں۔

"معاف کیجیے، ابّا جان۔ دراصل ہم نے آپ کی باتیں چھُپ کر سُننے کا پروگرام بنایا تھا، لیکن اچانک میرا ہاتھ دروازے سے ٹکرا گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ آج رات جو حالات پیش آئے ہیں، تم ان میں برابر کے شریک رہے ہو۔ بلکہ تم نے تو ہم سے بھی بڑھ چڑھ کر کام کیا ہے۔ اس لیے یہ تمام باتیں سُننے کا تمھیں بھی پُورا پُورا حق ہے۔ کیوں جناب، آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں؟" اُنھوں نے آخری جُملہ سیکرٹری صاحب سے کہا تھا۔

"بالکل نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ دونوں جان تو دے سکتے ہیں لیکن کسی کو یہاں ہونے والی گفت گو نہیں بتا سکتے۔ مگر یہ بچّی کون ہے؟" اُنھوں نے مُسکراتے ہوئے پُوچھا۔

"یہ میرے دوست مُنوّر علی خان کی بیٹی ہے۔ یہ بھی ان سے کم نہیں۔ آج رات اس نے بھی بڑا کام دکھایا ہے۔"

"بہت خُوب! تب مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ البتّہ یشوما سے پُوچھ لو۔"

"یشوما، تمھیں ان بچّوں کی موجُودگی پر تو کوئی اِعتراض نہیں؟ تم دیکھ ہی چُکے ہو، یہ شروع سے ہمارے ساتھ شریک رہے ہیں۔ بلکہ تم نے شروع میں پناہ بھی اِنھیں کے پاس لی تھی۔"

"مجھے کوئی اِعتراض نہیں۔" یشوما مُسکرایا۔

تینوں کُرسیوں پر اِطمینان سے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد مُنوّر علی خاں نے یشوما کی بات دُہرائی:

"دراصل آپ کو یہاں اِس لیے بُلایا گیا ہے کہ آپ ایک اور آدمی کو یہاں بُلوا دیں۔ میں جو کچھ کہوں گا، اس کے سامنے کہوں گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ پھر تم نے مجھے کیوں بُلایا؟" سیکرٹری صاحب نے کہا۔

"بُرا ماننے کی بات نہیں۔ یہ مُعاملہ کوئی ایک آدھ آدمی، ایک آدھ شہر، ایک آدھ مُلک کا نہیں، بلکہ کئی مُلکوں کا ہے۔ اس لیے مجھے جو ہدایت ملی ہے، اس پر عمل کروں گا۔ اگر آپ لوگوں کو یہ منظور نہیں تو پھر میں بھی کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں۔"

وہ اس کا بدلا ہوا لہجہ سُن کر چونک اُٹھے۔ آخر کار سیکرٹری صاحب نے کہا:

"اچھا بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟"

"اس مُلک میں دو آدمی ایسے ہیں جن میں سے کم از کم ایک کو یہاں بُلوا دیں۔ میں اس کی موجُودگی میں بتاؤں گا۔"

"اور ان کے نام کیا ہیں؟ وہ کیا کرتے ہیں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ البتّہ اُس نے کہا تھا کہ وہ بہت مشہور لوگ ہیں۔ آپ فوراً سمجھ جائیں گے۔"

"کِس نے کہا تھا؟" کامران مرزا نے سوال کیا۔

"یہ بتانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ اس سے آپ لوگوں کو کوئی مدد نہیں ملے گی۔"

"اچھا بتاؤ، اُن کے نام کیا ہیں؛ اگر ممکن ہوا تو ہم اسی وقت اُن میں سے کسی ایک یا دونوں کو یہاں لاتے

کی کوشش کریں گے۔"

"یہ آپ کی ذمے داری ہے۔ میں تو جلدی اس لیے کر رہا ہوں کہ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ ہر لمحے موت میری طرف بڑھ رہی ہے۔ میں کسی لمحے بھی دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہو سکتا ہوں۔" یشوما نے کہا۔

"تمھارے دشمنوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔ اب تمھیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔" کامران مرزا نے اسے دلاسا دیا۔

"تم نہیں جانتے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ کسی لمحے بھی یہاں پہنچ سکتا ہے۔" یشوما بولا۔

"اچھا خیر، ہم تمھاری ہر طرح حفاظت کریں گے۔ کہو تو تمھاری حفاظت کے لیے یہاں پولیس کا دستہ تعینات کر دیا جائے۔"

"پولیس کا دستہ اسے یا اس کے کسی کارکن کو نہیں روک سکے گا۔ اگر اسے یہ اطلاع مل چکی ہے کہ اس کے چھ کارکن گرفتار ہو چکے ہیں تو پھر وہ مجھ تک پہنچنے میں دیر نہیں کرے گا۔"

"خیر، تم جلد از جلد ان دو آدمیوں کے نام بتاؤ تاکہ ان میں سے جو نزدیک ہو، اسے بلا لیا جائے۔"

"اس ملک میں دو آدمی ایسے ہیں جو اس خطرے کے سامنے سینہ سپر ہو سکتے ہیں۔ خواہ وہ ختم ہو جائیں، اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ صرف یہی دو ایسے حضرات ہیں جو اس مہم پر روانہ کیے جا سکتے ہیں۔ یہ کس قدر دشوار مہم ہو گی، میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس مہم میں قدم قدم پر انھیں موت کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ ہر قدم پر نئے خطرات ان کے سامنے آئیں گے۔ ایسے خطرات کہ اگر میں ان کا صرف ذکر کر دوں تو آپ لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ لیکن ان کو بیان کر کے میں آپ کو ڈراؤں گا نہیں اور نہ وقت ہی ضائع کروں گا۔ بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت ہم ایک آتش فشاں کے دہانے کے اوپر بیٹھے ہیں جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے اور اس کے پھٹنے کی صورت میں ہم میں سے کوئی بھی نہ بچے گا۔ ہم سب موت کی گہری نیند سو جائیں گے۔ وہ بہت خوف ناک دماغ کا مالک ہے۔ اس کے دماغ کو پہنچنا بڑے سے بڑے سائنس دان کے بس سے بھی باہر ہے۔"

"تب پھر وہ دو حضرات کیسے اس تک پہنچ سکیں گے؟" کامران مرزا نے سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا۔ یہ وہ جانتا ہے جس نے مجھے اس

غرض کے لیے بھیجا ہے۔"

"اور یہ تم بتاؤ گے نہیں کہ وہ کون ہے؟"

"ہاں۔ میں مجبور ہوں۔ لیکن اس میں ہم سب کا فائدہ ہے، اور بتانے میں ان گنت خطرات ہیں۔"

سب دم بخود اس گفت گو کو سن رہے تھے۔ یشوما کی باتیں اُن کے دل دہلائے دے رہی تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے تھے۔ آفتاب، آصف اور فرحت پر خوف کے ساتھ ساتھ جوش کی حالت بھی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے، کاش! ہم اس مہم پر روانہ ہو سکتے۔

"ٹھیک ہے، تم نہ بتاؤ۔ ہم تمھیں مجبور نہیں کریں گے۔" کامران مرزا بولے۔

"اس کے ساتھ میں ایک رعایت بھی چاہوں گا۔"

"ہاں ہاں، ضرور۔ کیوں نہیں۔ تم ہمارے محسن ہو۔"

"اگر میں زندہ بچ گیا تو میری پوری بات سننے کے بعد مجھے میرے وطن پہنچانے کا انتظام کر دیا جائے۔ وہاں جانے کے لیے میری رُوح تڑپ رہی ہے۔ نہ جانے کون سی منحوس گھڑی تھی جب مجھے وہ خط ملا تھا، وہ چیک ملا تھا اور میں نے اپنے وطن سے قدم باہر نکالا تھا۔ لیکن اگر

ایسا نہ ہوتا تو شاید میں آج آپ لوگوں کو یہ سب کچھ نہ بتا رہا ہوتا۔ خیال رہے کہ میرے پاس پاسپورٹ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ سب چیزیں مجھ سے اُن لوگوں نے لے لی تھیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ یہ معمولی کام ہے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمھیں بحفاظت، جہاں تم کہو گے، پہنچا دیں گے۔"

"تب پھر ان دو میں سے کسی ایک کو یہاں بُلا لائیں۔ مجھے اس کو پوری تفصیل بتانی ہے تاکہ اسے کم سے کم خطرات پیش آئیں۔"

وہ سب خاموش رہے۔ ان کے دل دھڑک رہے تھے اور چہرے سُت گئے تھے۔ پھر جُوں ہی یشوما کی آواز اُبھری، مُنوّر علی خاں بُری طرح اُچھلے۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں باہر کو اُبل آئیں۔

سب ان کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ نہ جانے یشوما نے کیا کہا ہے کہ مُنوّر علی خاں اس حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ آخر کامران مرزا ہی بولے:

"کیا ہوا مُنوّر علی؟ خیر تو ہے؟ یشوما نے کیا کہا ہے؟"

"یشوما کہتا ہے، اس مہم پر صرف دو آدمی روانہ ہو سکتے

ہیں ۔ ایک انسپکٹر جمشید اور اُن کے بچّے ، اور دُوسرے کامران مرزا اور اُن کے بچّے ۔"

"کیا !!!"

وہ سب اُچھل پڑے ۔ اُن کے مُنہ کُھلے کے کُھلے رہ گئے ۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔ وہ حیرت کے مارے بُت بنے یشوما کو اس طرح گھُور رہے تھے جیسے وہ کسی دُوسری دُنیا کی مخلوق ہو اور سیدھا ان کے پاس چلا آیا ہو ۔

ننھّا تیر

یشوما نے اُن کو اس طرح اُچھلتے دیکھا تو اس کی حیرت کی اِنتہا نہ رہی ۔ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں انھیں دیکھنے لگا ۔ ان کی حیرت کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی ۔

کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے ۔ آخر یشوما نے کہا:

"میں سمجھ نہیں سکا ، آپ لوگوں کو ہوا کیا ہے یہ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے یا ایسے دو انسانوں کے نام لے دیے ہیں جن کا اس دُنیا سے کوئی تعلق نہ ہو؟ یقین کیجیے ، اس نے مجھے یہی دو نام بتائے تھے اور مجھے یقین ہے کہ میں بھُولا نہیں ہوں ۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو ، یشوما ۔ تمھیں ضرور یہی نام بتائے گئے ہوں گے ۔" مُنوّر علی خان نے جواب دیا ۔

"تب پھر آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے ؟ آپ سب چُپ کیوں ہو گئے ہیں ؟ کیا ان دونوں میں سے کسی ایک

کو بھی یہاں بُلانا ناممکن ہے ؟"

"یہ بات نہیں، یشوما۔" مُنوّر علی خاں نے کہا۔

"تو پھر کیا بات ہے ؟" اس نے حیران ہو کر پُوچھا۔

مُنوّر علی خاں نے ان سب کی طرف دیکھا اور کامران مرزا سے بولے "اسے بتا دُوں؟"

"بتانا ہی ہو گا۔" کامران مرزا نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"یشوما، یہ ایک حیرت انگیز اتّفاق ہے کہ تم نے جس گھر میں پناہ لی، وہ کامران مرزا ہی کا ہے۔ یہ تمھارے سامنے کامران مرزا بیٹھے ہیں۔ انھوں نے اور ان کے بچّوں نے ہی تمھیں دُشمنوں کے چنگل سے آزاد کرایا ہے۔ تم خوش قسمت ہو یشوما، بہت خوش قسمت۔"

"نہیں !!" یشوما کے مُنھ سے ایک چیخ کی شکل میں نکلا۔ تھوڑی دیر پہلے ان سب کی جو حالت ہوئی تھی، اب اس کی وہی حالت تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے کامران مرزا کو دیکھے جا رہا تھا۔ آخر اس کے لب ہلے:

"اُف! میرے خُدا! یہ میں کیا سُن رہا ہوں!"

"یہ بالکل ٹھیک ہے، یشوما۔ زندگی میں ایسے اِتّفاقات ہوتے ہی رہتے ہیں۔" مُنوّر علی خاں بولے۔

"پھر بھی اس قدر ناقابلِ یقین اِتّفاق۔ مجھے ابھی تک

یقین نہیں آ رہا۔"

"یشوما، تمھاری دُوسری شرط بھی پُوری ہو چکی ہے۔ ان دو میں سے یہاں ایک موجُود ہے۔ کامران مرزا اور اُن کے بچّے بھی۔ اب تو تمھیں کوئی اِعتراض نہیں ہو گا، سب کچھ بتا دینے پر۔"

"اب مجھے کسی قسم کا کوئی شک نہیں رہا۔ میں صحیح لوگوں کے درمیان ہوں۔ لیکن آپ لوگ مجھ سے کیا ہوا وعدہ یاد رکھیں۔ بھلا کون سا؟" یشوما خاموش ہو کر انھیں سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

"ہم جانتے ہیں یشوما، اور ہمیں اس ذمّے داری کا احساس ہے۔ یقین رکھو، تمھیں انشاءاللہ تمھارے وطن پہنچا دیا جائے گا۔"

"بہت بہت شکریہ۔ میں فوراً اپنے وطن پہنچ جانا چاہتا ہوں، کیوں کہ جب تک میں وہاں نہ پہنچ جاؤں گا، اس کا خوف سائے کی طرح میرے ساتھ رہے گا۔ یہ بھی ناممکن نہیں کہ وہ وہاں بھی پہنچ جائے، لیکن اپنے وطن میں آنے والی موت اتنی خوف ناک نہیں۔ میں آسانی سے مر سکوں گا۔ میرا وطن کتنا پیارا ہے۔ میں اس کے لیے تڑپ رہا ہوں۔"

"تم وہاں ضرور جاؤ گے، یشوما۔ ضرور جاؤ گے۔ بے فکر رہو۔ ہم اس کام کو فوراً کریں گے اور تمھارے وطن پہنچنے کے بعد ہی اس مُہم کو شروع کریں گے۔ اب جو باتیں تمھیں معلوم ہیں، وہ ہمیں بتا دو۔" کامران مرزا نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر کامران مرزا، میں تمھیں آج سے پہلے نہیں جانتا تھا لیکن یہ چند گھنٹے جو تمھارے ساتھ گزرے ہیں، ان سے مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ جس نے مجھے یہاں بھیجا ہے، وہ تم سے اور اس دوسرے آدمی سے خوب واقف ہے۔ وہ تمھارے بارے میں شاید سب کچھ جانتا ہے۔ وہ بہت ذہین ہے۔ میں اس کی ذہانت کو سلام کرتا ہوں اور اب اصل مقصد کی طرف آتا ہوں۔"

منوّر علی خاں ساتھ ساتھ اس کے جملوں کا ترجمہ کرتے جا رہے تھے۔ اس نے چند لمحے رُک کر کہا:

"وہاں موت ہے۔ ہر طرف موت کا راج ہے۔ وہاں کا ہر کارکن موت کا ہرکارہ ہے۔ ذرا سی لغزش وہاں سُرخ موت کے مُنھ میں دھکیل دیتی ہے۔ جو اس کے اشاروں پر نہیں چلتا..... سب کو اس کی موت کا منظر دکھایا جاتا ہے۔ یہ منظر اس قدر خوف ناک ہوتا ہے کہ ....."

یشوما خاموش ہو گیا۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس دوران میں اس کے صرف ہونٹ ہلتے رہے تھے۔ وہ لوگ اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگے۔ شاید وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو اُنھوں نے اسے حیران ہو کر دیکھا۔ اس کے ہونٹ ساکن تھے اور آنکھیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پلکیں تک نہیں جھپک رہا تھا۔

"یشوما! کیا بات ہے؟ کیا ہوا تمھیں؟" منوّر علی خاں نے کہا۔ مگر یشوما نے ان کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھا۔

"آخر بات کیا ہے؟ کیا تم کچھ بھول گئے ہو یا کچھ یاد آ گیا ہے؟" منوّر علی خاں نے دوبارہ کہا۔ اس پر بھی یشوما کچھ نہ بولا۔

اب تو وہ گھبرا گئے۔ کامران مرزا نے یشوما کو بغور دیکھا اور پھر بُری طرح چونکے۔ وہ پُوری قوّت سے چلّائے:

"یشوما!!"

ان کی آواز رات کے بھیانک سنّاٹے میں ڈرائنگ رُوم کی بلند دیواروں سے سر ٹکرا کر رہ گئی، لیکن یشوما کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔

کامران مرزا نے چھلانگ لگائی اور اس کے پاس پہنچ گئے۔ اُنھوں نے اُسے چھُو کر دیکھا۔ اس کا جسم پتّھر کی

طرح سخت اور سرد ہو چکا تھا۔ وہ گھبرا گئے۔ پھر ان کی نظر اس کے سینے پر پڑی۔ وہاں ایک ننھا سا تیر... سُرخ رنگ کا تیر چُبھا ہوا تھا۔ اس کی لمبائی سینے سے باہر صرف ایک انچ ہو گی۔ تیر کے بالکل سامنے ڈرائنگ رُوم کا دروازہ تھا جو تھوڑا سا کُھلا تھا اور اُس وقت کُھلا تھا جب آفتاب، آصف اور فرحت اندر آئے تھے۔ دُشمن اس جھری میں سے اپنا کام کر گیا تھا۔ تیر اِتنا ننھا سا تھا کہ کسی کو اس کے چلنے کی آواز تک سُنائی نہ دی تھی۔

کامران مرزا اندھا دُھند بھاگتے ہوئے باہر نکل گئے۔ باقی لوگ بوکھلا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور یشوما کی طرف لپکے اس کی کُھلی آنکھیں اُن سے کہہ رہی تھیں، میرا جی اپنے وطن جانے کے لیے بُری طرح تڑپ رہا ہے۔ دیکھو، کہیں بھول نہ جانا۔ مجھے میرے وطن پُہنچانے کا بندوبست ضرور کر دینا۔ میں فوراً وہاں جانا چاہتا ہوں۔ میرا وطن مجھے پُکار رہا ہے۔"

ان سب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ یشوما کو وطن پُہنچانے کا بندوبست کرتے، وہ اس دُنیا سے جا چُکا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا، "وہ" کسی وقت بھی اس تک پُہنچ سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔

انھیں ہوش آیا تو کامران مرزا وہاں سے جا چکے تھے۔ وہ شاید حملہ آور کے پیچھے گئے تھے۔

رات اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ وہ چُپ کھڑے یشوما کو دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب اس مُہم کا کیا ہو گا جس کی بابت یشوما انھیں بتانے والا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات بتا سکتا، اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا۔

اچانک مُنوّر علی خان چونک اُٹھے۔ اُنھوں نے سوچا، کامران مرزا دشمنوں کے تعاقب میں گئے ہیں۔ کہیں وہ ان میں گھر نہ جائیں۔ دُشمن کس قدر خوف ناک اور خطرناک تھے، یہ ان سب کو اندازہ ہو چکا تھا۔ اُنھوں نے چِلّا کر کہا:

"میں کامران مرزا کے پیچھے جا رہا ہوں۔ تم لوگ یہیں ٹھہرو۔"

"چچا جان، ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے" آفتاب اور آصف نے ایک ساتھ کہا۔

"ہم سب چلیں گے" سیکرٹری صاحب نے کہا۔

اور پھر وہ سب گھر سے باہر نکل آئے اور سیکرٹری صاحب کی کار میں بیٹھ گئے۔ اُنھوں نے اگلی سیٹ پر بیٹھ کر کار چلا دی۔

سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔ وہ سڑک پر اوندھے منہ گر گئے۔ گولیاں اب بھی ان کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔

"سڑک سے نیچے اتر چلو۔" منور علی خاں نے کہا۔

انھوں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا اور پیٹ کے بل رینگتے ڈھلوان زمین پر آ گئے۔ اب وہ گولیوں کی زد سے باہر ہو چکے تھے

اس عالم میں آدھا گھنٹا گزر گیا۔ پھر کہیں جا کر فائرنگ کا سلسلہ بند ہوا۔ اور پھر تاروں بھرے آسمان کے نیچے انھوں نے سڑک کے بیچوں بیچ کسی کو اپنی طرف آتے دیکھا منور علی نے دبی زبان میں پوچھا:

"جناب، کیا آپ کے پاس پستول ہے؟" انھوں نے یہ جملہ سیکرٹری صاحب سے کہا۔ جواب میں انھوں نے نفی میں سر ہلایا اور بولے:

"میں گھر سے لڑنے کے لیے نہیں نکلا تھا۔"

"افسوس! میں بھی کوئی ہتھیار ساتھ نہیں لایا۔" منور علی خاں بولے۔

"اب کیا ہو گا؟ نہ جانے آنے والا کون ہے؟"

"درختوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کریں۔ نہ جانے یہ کون ہے اور کس سے لڑتا رہا ہے۔" منور علی خاں نے کہا۔

وہ جلدی جلدی درختوں کے پیچھے چھپنے لگے۔

یشوا کون تھا؟ وہ کامران مرزا کو کیا بتانا چاہتا تھا؟ یہ جاننے کے لیے سرخ تیر کا دوسرا حصہ "سرخ تیر کا شکار" پڑھیے۔

"لیکن جائیں کس طرف؟"

"دشمن شمالی سڑک کی طرف ہی جا سکتے ہیں۔ اس طرف سرحد ہے۔" کامران مرزا نے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن وہ سرحد کیسے پار کر سکتے ہیں؟"

"ان کے پاس کوئی نہ کوئی ذریعہ تو ضرور ہو گا۔"

"اچھا، میں اسی طرف چلتا ہوں۔"

انھوں نے کار تیزی سے موڑی اور پوری رفتار پر چھوڑ دی۔ گھر سے باہر نکلنے کے بعد انھوں نے کامران مرزا کی موٹر سائیکل دیکھ لی تھی۔ وہ وہاں موجود نہ تھی۔ وہ جان گئے تھے کہ کامران مرزا دشمنوں کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گئے ہیں۔

کار پندرہ منٹ تک دوڑتی رہی۔ اب میدانی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ انھیں راستے میں اس وقت تک کوئی گاڑی آگے جاتی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کہیں وہ غلط سمت میں تو نہیں نکل آئے۔

اچانک سیکرٹری صاحب نے کار کی رفتار آہستہ کر دی۔ دور..... بہت دور، سڑک کے بیچوں بیچ کوئی چیز پڑی تھی۔ اتنی دور سے وہ یہ نہ جان سکے کہ وہ کیا چیز تھی۔ کار رفتہ رفتہ اس چیز سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔

پھر وہ چونک اٹھے۔ ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ یہ تو کوئی موٹر سائیکل تھی۔ آفتاب، آصف اور فرحت کے رنگ سفید پڑ گئے، اس خیال سے کہ کہیں یہ موٹر سائیکل ان کے والد اور چچا کی نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو؟ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ سوچ سکے کانپ کر رہ گئے۔ سیکرٹری صاحب نے زوردار بریک لگائے۔ کار موٹر سائیکل کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ وہ جلدی جلدی کار سے نیچے اترے اور موٹر سائیکل کی طرف بڑھے۔ دوسرے ہی لمحے ان کے ہوش گم ہو گئے۔ موٹر سائیکل انسپکٹر کامران مرزا ہی کی تھی۔ وہ ساکت کھڑے موٹر سائیکل کو دیکھتے رہ گئے۔ منور علی خان ہمت کر کے کچھ اور آگے بڑھے اور جھک کر موٹر سائیکل کو بغور دیکھنے لگے۔ اچانک ان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ موٹر سائیکل کے پاس پختہ سڑک پر خون کا ایک بڑا سا دھبا موجود تھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر خون کا ایک اور دھبا دکھائی دیا۔ وہ اس کے پاس پہنچے۔ خون کے دھبوں کا سلسلہ کافی دور تک چلا گیا تھا۔ تقریباً پچیس گز دور آنے کے بعد وہ رک گئے۔ اس سے آگے خون کا کوئی دھبا نہ تھا۔ وہ رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ سڑک کے دونوں طرف گھنا جنگل تھا اور رات کی تاریکی میں جنگل میں گھسنا موت کو آواز دینا تھا۔ وہ بے چارگی کے عالم میں ہاتھ ملتے رہے۔

پھر اچانک جنگل کی فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے بعد اوپر تلے تین چار فائر ہوئے۔ گولیاں ان کے دائیں بائیں